Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1960ء

THE FUNDAMENTAL LAW to all Muslims irrespective of their differences is the Quran. There is, therefore, no choice except this : either reject Quran and drift as we have drifted this last one decade : or accept Quran and boldly live by it.

(Answer to the Questionnaire issued by the Pakistan Constitution Commission.)

تمام باہمی اختلافات کے باوجود، مسلمانوں کے پاس ایک بنیادی ضابطہ قوانین بطور قدر مشترک موجود ہے - اور وہ ہے قرآن عظیم - لہٰذا ہمارے سامنے صرف دو راستے ہیں : یا تو قرآن کریم کو چھوڑ کر اسی طرح بھٹکتے پھریں جسطرح گزشتہ دس سال سے پھر رہے ہیں - اور یا اسے اپنے آئین کی بنیاد قرار دیکر جرأت مندانہ انداز سے اس کے مطابق زندگی بسر کریں -

(آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون: ۷۵۰۰	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
خط و کتابت کا پتہ	ہند و پاکستان ۸/	ہند و پاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور	بارہ آنے	غیر ممالک سے: ۱۶ شلنگ

نمبر ۷	جولائی سنہ ۱۹۶۰ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	۲
لمعات	۳
آئینِ پاکستان اور علمائے کرام	۱۹
کتاب و سنت	۳۳
ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)	۷۷

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

دنیا میں مخلص اور غمخوار دوستوں کا مل جانا فطرت کا بے بہا عطیہ ہے لیکن فطرت اس عطیے کی جو قیمت وصول کرتی ہے اس کا اندازہ وہی حرماں نصیب لگا سکتا ہے جس سے اس قسم کے رفیق ایک ایک کر کے چھنتے جائیں اور وہ سفرِ زندگی میں تنہا رہ جائے۔ میرے آنسو ہنوز بھائی (مرحوم) کی یاد میں خشک ہونے نہ پائے تھے کہ ۵ ارجون کو میری زندگی کا ایک اور سہارا ٹوٹ گیا۔ کون تھا۔ امرتسر، کلکتہ، دہلی اور کراچی میں کون ہے جو ڈاکٹر حمید کو نہیں جانتا۔ وہ اپنے فن کا امام اور مجتہد۔ وہ ہر دلعزیز و مشفق معالج۔ وہ رونقِ محفل۔ وہ شمعِ مجلس۔ وہ "یاروں کا یار"۔ وہ ہر ملنے والے کا غمخوار۔ وہ دریا دل دوست۔ وہ "کھلا ڈلا" انداز کا بڑا پیارا انسان۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جہانِ دانش و بینش کا لقمان۔ وہ قلندرانہ حوصلوں کا مالک۔ وہ سکندرانہ ارادوں کا پیکر۔ وہ مستِ جامِ محبت۔ وہ سرشارِ بادۂ الفت۔ وہ دوستوں کی خاطر سب کچھ لٹا کر خوش ہونے والا۔ وہ سب کچھ لٹ جانے پر بھی کبھی غم نہ کھانے والا لیکن دوسروں کے غم میں ہمیشہ جان گھلانے والا۔ وہ اپنی ہر پریشانی کو ہنسی میں اڑا دینے والا لیکن دوسروں کی پریشانی پر راتوں کی نیند حرام کر لینے والا۔ وہ غریبوں کا غمگسار۔ وہ بیکسوں کا چارہ ساز۔ وہ یتیموں کا وارث۔ وہ بیواؤں کا سہارا۔ وہ اجڑتے ہوئے گھرانوں کو بسانے والا۔ وہ گرتوں کو سنبھالنے والا۔ وہ ڈوبتوں کو بچانے والا۔ وہ دوسروں کی آگ میں بے خطر کود جانے والا ــــ وہ پرویز کا جگری دوست وہ قرآن کا سچا عاشق ــــ ہاں وہی ڈاکٹر حمید جس نے اپنی علالت کے خطرناک ہونے کی مجھے محض اسلئے اطلاع نہ ہونے دی کہ میں اس سے پریشان ہو جاؤں گا۔ جب ۱۵ جون کی صبح (ان کے بیٹے) عزیزی سعید نے مجھے ٹیلیفون پر کہا کہ اب آپ آنے میں دیر نہ کیجئے تو میں اڑتا ہوا گیا۔ پہنچا لیکن ــــ میرے حصے میں اس پیکرِ مہر و وفا کو سپردِ خاک کرنے سے زیادہ کچھ نہ آیا۔

ایسا غمگسار دوست۔ ایسا جاں نثار ساتھی۔ ایسا کشادہ ظرف رفیق۔ ایسا پاکباز انسان۔ جس کا دل آئینہ کی طرح شفاف اور جس کی ساری زندگی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ تھی، اب کہاں سے ملے گا؟

ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں کبھی تنہا نہیں رہنے دوں گا۔ پھر یہ عہد فراموشی کیوں؟ جانے والے منہ موڑ کر جانے والے کچھ تو میری تنہائی پر رحم کھایا ہوتا۔ کچھ تو سوچا ہوتا کہ میری زندگی کے باقی دن کیسے کٹیں گے!

ڈاکٹر صاحب! "پھوپا" رو رہی ہے کہ مجھے آ کر بہلاؤ۔ "ممی" پکار رہی ہے کہ ہمیں آ کر کہانیاں سناؤ۔ آپ تو ان بچوں کی بات کبھی نہیں ٹالا کرتے تھے۔ اب آپ ان کی پکار کا جواب کیوں نہیں دیتے؟

ہاں! اب آپ ہماری کسی پکار کا جواب نہیں دیں گے۔ آپ اس ابدی سکون میں ہیں جہاں ہماری کوئی آواز آپ کو پریشان نہیں کر سکے گی۔ بہت اچھا۔ آپ سکون میں رہئے۔ ہمیں پریشان ہوتے رہنے دیجئے۔

تری یہ خوشی ہے تو اس خوشی پہ بہارِ عمر نثار ہے

جگر فگار۔ پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوع اسلام کی زندگی کا مقصد دنیا میں قرآنی نظام کا احیاء اور ترویج ہے۔ چونکہ اس مقصد کا آغاز ایک آزاد اسلامی مملکت کے بغیر ناممکن ہے اس لئے اس نے ہندوستان میں تحریک پاکستان کی تائید کی اور اپنی بساط کے مطابق اس کی کامیابی میں حصہ لیا۔ جب ۱۹۴۷ء میں ایک خطۂ زمین مل گیا جس میں قرآنی نظام کی داغ بیل ڈالی جا سکتی تھی تو اس نے اس نظام کا تصور عام کرنا شروع کیا تاکہ یہ آئینی شکل اختیار کر کے پاکستان کا عملی نظام بن سکے۔ یہ جدوجہد اس وقت تک جاری ہے۔ چونکہ اب پاکستان کے لئے آئین کی ترتیب کا سوال پھر سامنے آیا ہے اس لئے طلوع اسلام کی اس جدوجہد کی رفتار میں تیزی پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ اس مقصد کے لئے طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن (منعقدہ اپریل ۱۹۶۰ء) میں ایک پروگرام مرتب کیا گیا جس کے مطابق، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا کام ایک مرکزی پبلسٹی کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ یہ کمیٹی نہایت عرق ریزی اور تن دہی سے اپنے فرائض مفوضہ کی سرانجام دہی میں مصروف ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے پہلے "اسلامی آئین کے بنیادی اصول" (اردو اور انگریزی میں) ہزارہا کی تعداد میں شائع اور تقسیم کئے اور جن حضرات نے ان سے اتفاق کیا ان کی آراء آئینی کمیشن تک پہنچائی۔ اس کے بعد آئینی کمیشن کے سوالنامہ اور (قرآن کی روشنی میں) اس کے جوابات کی نشر و اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔ ملک نے ان جوابات میں جس قدر دلچسپی لی ہے وہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ پاکستان کی فضا قرآنی نظام زندگی کے لئے کس قدر سازگار ہو چکی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

سوالنامہ کے جوابات بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ جون تک ہے۔ اس کے بعد کرنے کا کام یہ ہوگا کہ جب کمیشن کی طرف سے انفرادی ملاقات کا پروگرام شائع ہو تو جو حضرات قرآنی نظام کے حق میں ہیں وہ اپنا نقطۂ نظر بہ دلائل و براہین کمیشن کے سامنے پیش کریں۔

طلوع اسلام کی طرف سے مرتب کردہ جوابات میں حسب ذیل نکات کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

(۱) مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر سرانجام پائے اور ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

(۲) تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی کی بہم رسانی مملکت کا فریضہ ہو۔ نیز مملکت ایسا انتظام کرے جس سے تعلم

افراد کو ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے یکساں ذرائع اور مواقع میسر ہوں۔

(۳) حکومت کا نظام صدارتی انداز کا ہو لیکن اس میں ایسی آئینی شقیں رکھی جائیں جن کی رو سے انتظامیہ کے اختیارات حدود فراموش نہ ہونے پائیں۔ بالفاظ دیگر، پارلیمنٹ اور انتظامیہ کے اختیارات کی تقسیم اس انداز سے کی جائے کہ ان میں سے کوئی اپنی حد سے آگے بڑھنے پائے اور نہ ہی نظام میں تعطل واقع ہو۔

(۴) مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود قرآنی نظام کے یکسر خلاف ہے۔ پارٹیوں کو فی الفور ممنوع قرار دیا جائے اور ملک میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس سے مذہبی فرقے بھی بتدریج ختم ہو کر اجزائے ملت بن جائیں۔

(۵) غیر مسلم (جو اسلامی آئیڈیالوجی پر ایمان نہیں رکھتے) رموز مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکتے۔ وہ مسلم قوم کے افراد نہیں۔

ان میں سے شق ۔۔ کے خلاف کوئی اعتراض ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ باقی شقوں پر بعض گوشوں کی طرف سے اعتراضات عائد کئے گئے ہیں۔ ذیل میں مختصر الفاظ میں ان اعتراضات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) مملکت کا کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر سرانجام پائے ..... الخ

ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے اس شق کی مخالفت کی گئی ہے۔ (ان کی طرف سے قرآن کریم کی مخالفت غیر متوقع نہیں تھی) انہوں نے تجویز کیا ہے کہ مملکت کا نظم و نسق "کتاب و سنت" کے مطابق سرانجام پائے اور ملک میں کوئی قانون ایسا نافذ نہ ہو جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔

جیسا کہ ہم شروع سے لکھتے چلے آرہے ہیں، یہ مقام بڑا نازک ہے اس لئے اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اس پر ایک تفصیلی مقالہ میں گفتگو کی ہے جو اسی اشاعت میں (چند صفحات آگے جاکر) آپ کے سامنے آجائے گا۔ درخواست ہے کہ آپ براہ کرم اس مقالہ کا غور و فکر سے مطالعہ کریں۔ ہماری شروع سے دیانتدارانہ رائے یہ چلی آرہی ہے کہ جن حالات میں مسلمان اس وقت گھرے ہوئے ہیں ان کے لئے حسب ذیل صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

(الف) اگر ہم اسی نظام کا احیاء چاہتے ہیں جو نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں متشکل ہوا تھا تو اس کی واحد شکل یہ ہے کہ قرآن کریم کو نظام کی اصل و بنیاد قرار دیا جائے اور حق و باطل کا معیار بھی اسی کو سمجھا جائے۔ قرآن کریم تمام مسلمانوں میں مشترک عنصر ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جس پر تمام امت کو جمع کیا جا سکتا ہے۔

(ب) اگر قرآن کریم کے ساتھ کسی اور عنصر (روایات یا فقہ) کو نظام کی اصل و بنیاد قرار دیا گیا تو وہ نظام کبھی قابل عمل نہیں ہو سکے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ

(ج) ملک کا نظام دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا ۔۔۔ یعنی ملکی اور شخصی۔ ملکی نظام سیکولر طریق سے سرانجام پائے گا اور شخصی معاملات کا فیصلہ "شریعت" کی رو سے کیا جائے گا۔ یعنی وہی نظام جو انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں ہم

پر مسلط تھا۔ اس سے ملک میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو جائیں گی ــــ ایک ارباب نظم و نسق کی اور دوسری ارباب شریعت کی۔ یہ صورت اسلام کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں ملکی اور شرعی امور کی قطعاً تفریق نہیں۔

جاندہبی قدامت پسند طبقہ (ب) پر اصرار اس لئے کرتا ہے کہ اس سے (ج) کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں ان کا اقتدار قائم رہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں، اس انداز حکومت کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چونکہ ملک میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو چاہتا ہے کہ یہاں سیکولر انداز کی حکومت قائم ہو اس لئے ہمارے قدامت پرست طبقہ کو اس کی تائید حاصل ہو جائے گی۔ اس سے ہمیں خطرہ ہے کہ یہ ملک کبھی اسلامی نظام کی تجربہ گاہ نہیں بن سکے گا۔

شق ۳۔ صدارتی یا پارلیمانی نظام

شروع مئی میں لاہور میں ۳۰ انیس علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات مرتب کئے گئے۔ جو کچھ انہوں نے اپنے جوابات میں کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو منسوخ کرنا حماقت تھی۔ اسے دوبارہ نافذ کیا جائے۔ اس میں پارلیمانی انداز حکومت طے پایا تھا اس لئے پاکستان میں اسی انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ سیاسی پارٹیوں کو زندہ کیا جائے اور صدر کا از سر نو انتخاب کیا جائے۔ اس کے قریب ایک ماہ بعد چوہدری محمد علی صاحب نے بھی انہی مطالبات کا اعادہ کیا ہے۔ (ان کے جوابات میں اگرچہ صدر کے انتخاب کا ذکر نہیں لیکن سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے نفاذ کا لازمی نتیجہ صدر کا از سر نو انتخاب ہے)۔

طلوع اسلام سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کا شروع ہی سے مخالف تھا۔ اس لئے کہ اس آئین کے مطابق، ملک میں قرآنی نظام کا قیام ناممکن تھا۔ اس لئے اس آئین کی تنسیخ اس کے نزدیک نیک فال تھی بشرطیکہ جو آئین اس کی جگہ لے وہ صحیح معنوں میں اسلامی آئین ہو۔ یہ وجہ تھی کہ اس نے اس آئین کی تنسیخ پر اظہار اطمینان کیا تھا۔ اس کے نزدیک اس آئین کا دوبارہ نفاذ ملک کو قرآنی نظام سے بہت دور لے جائے گا۔

جہاں تک دور حاضر کے صدارتی یا پارلیمانی انداز کا تعلق ہے، ان دونوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اسے اسلامی انداز کہا جا سکے۔ اسلام ایک الگ نظام تجویز کرتا ہے۔ وہ نظام اسلامی آئین کا نتیجہ ہوگا۔ لیکن جب تک ہم اس تک نہیں پہنچتے، ہمیں بر سبیل تنزل کوئی اور انداز اختیار کرنا ہوگا۔ طلوع اسلام نے جس انداز کی سفارش کی ہے وہ ان دونوں نظاموں کے بین بین رہتا ہے۔ اس میں پارلیمانی نظام کی خرابیاں بھی کم از کم حد تک سمٹ جاتی ہیں اور صدارتی نظام کے ممکن خطرات بھی بڑی حد تک مفقود ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نظام قابل عمل بھی ہے اور ملک کی ترقی کا موجب بھی لیکن اگر یہاں اس کے بجائے مغرب کا پارلیمانی نظام (جو سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں طے پایا تھا) رائج کر دیا گیا تو ملک پھر اسی "جمہوری تماشا" کی آماجگاہ بن جائے گا جسے ہم عسکری انقلاب سے پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یہ "تماشا" وہ تھا جس کے تباہ کن نتائج کو پہلے دیکھ کر طلوع اسلام نے اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا ــــ یاد رہے عسکری انقلاب، اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں آیا تھا اور طلوع اسلام

لے یہ کچھ ایک سال پہلے اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا کہ ـــــ

> حالات ہیں خود بخود اس منزل تک لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اس "جمہوری تماشے" کو ختم کر کے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دے دیا جائے۔ (طلوع اسلام۔ اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء صفحہ)

ہم مغرب کے پارلیمانی نظام کے خلاف بہت سے دلائل و شواہد پیش کر سکتے ہیں لیکن اس مقام پر اس تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں گے۔

(۴) مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

یہ حقیقت قارئین طلوع اسلام کے علم تک ہی محدود نہیں بلکہ ملک کے موافق اور مخالف طبقات کے تمام حضرات اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ طلوع اسلام کا بنیادی مسلک یہ ہے کہ مذہبی فرقوں (یا سیاسی پارٹیوں) کا وجود قرآن کریم کی رو سے شرک ہے اور جس نظام میں یہ تفرقہ باقی رہے وہ نظام کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ خود سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے خلاف اس کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ اس میں مذہبی فرقوں کو آئینی سند عطا کر دی گئی ہے۔ طلوع اسلام نے اپنے اسی مسلک کو کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات میں دہرایا ہے لیکن ملک کے بعض حلقوں کی طرف سے اس کی مخالفت اس انداز سے ہوئی ہے گویا طلوع اسلام نے یہ بات پہلی مرتبہ کہی ہے۔ معلوم نہیں یہ حضرات اس تمام عرصہ میں کہاں بستے تھے؟ طلوع اسلام میں اس موضوع پر اس قدر شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے کہ اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو کتنی ضخیم مجلدات مرتب ہو جائیں۔ اس مقام پر ان تمام امور کا دہرانا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ ہذا ہم اس وقت ان اعتراضات کے تجزیہ پر اکتفا کریں گے۔

مؤقر جریدہ نوائے وقت (لاہور) نے اپنی ۱۲ر جون کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "نیا فتویٰ"۔ اس میں لکھا ہے

> پرویز صاحب کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اعتراض سیاسی پارٹیوں سے متعلق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پوری ملت ایک پارٹی ہے اور اس کے اندر مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ قرآن اسے شرک قرار دیتا ہے ...... یہ ذہنیت بڑی افسوسناک ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے یا کسی وجہ سے ناپسند ہو اس پر بلا تکلف کفر یا شرک کا فتویٰ عاید کر دیا جائے۔

گذارش ہے کہ نہ یہ فتویٰ نیا ہے اور نہ ہی اس کے مفتی پرویز صاحب ہیں۔ یہ فتویٰ چودہ سو سال پرانا ہے اور اس کے صادر فرمانے والے خود اللہ تعالیٰ ہیں جنہوں نے قرآن کریم میں مسلمانوں سے کہا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۔۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

اور تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا

گئے اور پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔[1]

پرویز صاحب اپنی طرف سے کبھی کچھ نہیں کہتے۔ وہ مسلمانوں کے سامنے قرآن کا آئینہ رکھ دیتے ہیں۔ اب اگر کسی کو اس آئینہ میں اپنے خط و خال دیکھ کر غصہ آجائے تو اس میں آئینہ یا آئینہ بردار کا کیا قصور ہے؟

آگے چل کر جریدۂ مذکور رقمطراز ہے۔

> ہم مذہبی فرقوں کے بارے میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ مذہبی فرقے کم و بیش خود مذہب کے ہم عمر ہیں اور ماضی میں، کوئی حکومت قانوناً انھیں ختم نہیں کر سکی۔ موجودہ حکومت کے سامنے اور بہت سے کام ہیں اسے مذہبی فرقوں سے الجھ کر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وقت وہ کسی تعمیری کام پر کیوں نہ صرف کرے۔ سنیوں، شیعوں یا اہلِ حدیث کو ختم کرنے کے لئے اپنی توانائی صرف کرنے سے کہیں بہتر اور زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ سرکار اپنی اس توانائی کو اسمگلروں۔ رشوت خوروں اور دوسرے سماج دشمن عناصر کے استیصال پر صرف کرے۔

اس ضمن میں ہم صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذہبی فرقے بے شک "مذہب" کے ہم عمر ہیں۔ لیکن وہ خدا کے دیئے ہوئے "دین" کے ہم عمر نہیں (معلوم نہیں ہمارا یہ ہم عصر "مذہب" اور "دین" کے فرق کو بھی سمجھ سکے گا یا نہیں!)۔ دین نبی اکرمؐ کے زمانے میں سامنے آیا تھا اور اس وقت مسلمانوں میں نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا اور نہ سیاسی پارٹی۔ یہ اُس وقت وجود میں آئے جب خدا کا دین انسانوں کے خود ساختہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد ہماری جس قدر حکومتیں وجود میں آئیں وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں اسلامی حکومتیں نہیں تھیں[2] اس لئے انھوں نے فرقوں کو مٹانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ فرقوں کا وجود ان کے حق میں "باعثِ رحمت" تھا۔ وہ انھیں کیوں مٹاتے؟ قرنِ اول کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک مملکت اپنے آپ کو اسلامی بنانا چاہتی ہے اس لئے یہ سوال سامنے آیا ہے کہ پارٹیوں اور فرقوں کو کیسے ختم کیا جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ جس چیز کو قرآن شرک قرار دیتا ہے ایک اسلامی مملکت کو اس کے استیصال پر وقت ضائع کرنا چاہیئے یا نہیں، تو اس کا تعلق اس سے ہے کہ انسان کس بات کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ جو شخص توحید (وحدت ملت وحدت سرچشمۂ قانون اور وحدت فکر و عمل) کو سماج دشمن عناصر جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا اس کے نزدیک شرک کے استیصال کے

---

[1] واضح ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی اور گروہ سازی کو شرک قرار دیا ہے تو اس سے صرف "مذہبی فرقے" مراد نہیں۔ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں۔ وہ "دین" میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے اور "دین" کے اندر مذہب اور سیاست دونوں آجاتے ہیں۔ لہٰذا اس کا جو حکم مذہبی فرقوں کے متعلق ہے وہی سیاسی پارٹیوں کے متعلق ہے۔

[2] خدا کرے کہ "مسلمانوں کی حکومت" اور "اسلامی حکومت" کا فرق جریدۂ مذکور کی سمجھ میں آجائے۔

لئے کچھ سوچنا یا کرنا تضیعِ اوقات ہے۔ جب ہمارے معاصر کے نزدیک دین کے بنیادی اصول کی قیمت اور اہمیت اتنی ہی ہے تو پھر کچھ میں نہیں آتا کہ ملک میں اسلامی آئین۔ اسلامی نظام۔ اسلامی مملکت کا جو ہنگامہ برپا ہو رہا ہے اس سے حاصل کیا ہے! سیدھی طرح سیکولر حکومت قائم کیجئے، ورنہ قوم کا وقت اور توانائی ان "بیکار" مباحث میں ضائع ہو رہی ہے اسے کسی "تعمیری کام" میں صرف کیجئے۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

> رہا سیاسی پارٹیوں کا سوال، تو یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ایک طرف تو جمہوری نظام کا نام لیا جائے اور اس کی حمایت کی جائے اور دوسری طرف یہ کہا جائے کہ ملک میں سیاسی پارٹیوں کا وجود کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ شرک ہے۔ جمہوری نظام (خواہ اس کی صورت صدارتی ہو یا پارلیمانی (یا وزارتی)) کم از کم دو مضبوط سیاسی پارٹیوں کے بغیر نہیں چل سکتا...... اگر جمہوری نظام سے وابستگی کا اعلان واقعی مخلصانہ ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینا مقصود نہیں۔ تو پھر اس کے ساتھ ایک ہی سانس میں سیاسی جماعتوں پر مستقل طور پہ پابندی کا مطالبہ ژولیدہ دماغی اور پریشان خیالی کی انتہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے جریدۂ مذکورہ نے طلوعِ اسلام کا کوئی ایک آدھ فقرہ کہیں سے سن لیا ہے اور اتنی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی کہ جس کے خلاف اس شدت سے اعتراض کئے جا رہے ہیں، اس کے متعلق اتنا تو معلوم کر لیا جائے کہ وہ کہتا کیا ہے؟ طلوعِ اسلام نے مغرب کے جمہوری نظام کو ہمیشہ ملعون قرار دیا ہے اور وہ اس کے خلاف مسلسل جہاد میں مصروف چلا آ رہا ہے۔ وہ اسلامی جمہوریت کا داعی اور نقیب ہے جس میں نہ کوئی پارٹی ہوتی ہے نہ فرقہ۔ یہ وہ جمہوریت ہے جس کا تصور قرآن کریم نے دیا ہے اور جسے رسول اللہؐ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ جن حضرات کے نزدیک مغرب کا جمہوری نظام "منزل من اللہ" ہے ان کے لئے پارٹیوں کے وجود سے مفر نہیں لیکن جو لوگ قرآن کے جمہوری نظام پر ایمان رکھتے ہیں وہ فرقوں اور پارٹیوں کو جسدِ ملت کے لئے ناسور سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد معاصر مذکور نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر ہمیں دلی صدمہ ہوا کہ ہمارے ہاں کی صحافت کی سطح کیا ہے؟ اس نے لکھا ہے کہ

> خدا جانے پرویز صاحب قائد اعظمؒ کے اس نظریہ اور عمل کو کیوں بھول گئے کہ وہ مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی اور سب سے نمائندہ جماعت یا سیاسی پارٹی، مسلم لیگ کے قائد تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں دس ہزار مرتبہ کہا کہ پاکستان حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی سیاسی پارٹی مسلم لیگ کو مضبوط بناؤ اور اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ...... اس وقت پرویز صاحب بھی مسلم لیگ کے حامی تھے اور انہوں نے اپنی بساط کے مطابق تحریکِ پاکستان کی خدمت بھی کی ـــــ کیا اصول وقت کے مطابق بدل جاتے ہیں! اس زمانے میں مسلمانوں میں سیاسی پارٹی بندی جائز تھی اور اب قرآن اسے شرک قرار دیتا ہے؟

یہ غنیمت ہے کہ جریدۂ مذکور طلوع اسلام کا یہ نظریہ خود ہی نقل کر چکا ہے کہ

> پوری ملت ایک پارٹی ہے اور اس کے اندر مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں کا وجود کسی صورت میں جائز نہیں۔

یہی وہ اصول تھا جس کی عملی تشکیل کی کوشش ہندوستان میں کی گئی تھی۔ وہاں ہندو اور مسلمان ایک ملک میں رہتے تھے۔ ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ اس وطن پر رہنے والے (تمام باشندے) ایک قوم یا ایک جماعت ہیں۔ تحریک پاکستان کے حامیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم یا جماعت ہیں۔ اس دعویٰ کو منوانے کے لئے ضروری تھا کہ وہاں کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو منظم کیا جائے۔ اس تنظیم کا نام مسلم لیگ تھا۔ جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں سیاسی پارٹی تھی۔ پارٹی ہی نہیں بلکہ ایک جداگانہ قوم یا ملت اسلامیہ کی نمائندہ جماعت تھی۔ چونکہ ملت کے اندر سیاسی پارٹیوں کا وجود جائز نہیں ہوتا اس لئے قائداعظم مسلمانوں کی دوسری سیاسی پارٹیوں کے مخالف تھے اور انہیں بار بار دعوت دیتے تھے کہ وہ اپنی پارٹیوں کو ختم کر کے ملت کی نمائندہ جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کسی تنظیم کا سوال باقی نہ رہا اس لئے مسلم لیگ کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ چنانچہ طلوع اسلام نے، جو ہندوستان میں مسلم لیگ کا سب سے بڑا حامی تھا، تشکیل پاکستان کے فوری بعد یہ تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔ اس نے اپنی مئی ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> چونکہ پاکستان میں رہنے والے تمام مسلمانوں کا نصب العین حیات ایک ہو چکا ہے (یا یوں کہئے کہ ایک ہونا چاہیئے) یعنی مملکت پاکستان کا استحکام بدیں مقصد کہ یہاں قرآنی نظام زندگی رائج کیا جائے، اس لئے یہاں اب کسی پارٹی کی ضرورت نہیں جو مسلمان اس نصب العین کو اپنا نصب العین نہیں سمجھتا وہ پاکستان اور اسلام کا دشمن ہے۔
>
> (۲) چونکہ پاکستان میں کسی پارٹی کی ضرورت نہیں اس لئے مسلم لیگ کی بھی ضرورت نہیں۔
>
> (۳) چونکہ ملت اور حکومت دو جداگانہ چیزوں کا نام نہیں۔ اس لئے حکومت تمام ملت کی مشترکہ ہونی چاہیئے۔ کسی خاص پارٹی کی نہیں ہونی چاہیئے۔ (ص ۹۳)

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ طلوع اسلام کے پیش کردہ اصول وقت کے ساتھ بدل نہیں جاتے۔ اس کے اصول وہی رہتے ہیں (کیونکہ یہ اصول قرآن کریم سے اخذ کردہ ہوتے ہیں) ہندوستان میں بھی اس نے یہی اصول پیش کیا تھا کہ پوری کی پوری ملت ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر مختلف پارٹیوں کا وجود ناجائز ہے۔ اور اب بھی یہی کہتا ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستانیہ ایک پارٹی ہے (جسے قرآن حزب اللہ ۔۔۔ اللہ کی پارٹی۔ کہہ کر پکارتا ہے) اس کے اندر پارٹیوں کا وجود قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ چونکہ ہندوستان میں تحریک پاکستان کے مخالف مسلمانوں نے اپنی اپنی پارٹیوں کو توڑا نہیں تھا اس لئے وہاں ضرورت تھی کہ ملت کی اس تنظیم کا الگ نام رکھا جائے تاکہ انگریز اور ہندو کو اس سے متعارف کرانے میں آسانی رہے۔ اگر وہاں دیگر پارٹیاں ختم ہو جاتیں تو مسلم لیگ

کے الگ نام کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اس صورت میں پاکستان کی جنگ "ہندی مسلمانوں" اور غیر مسلموں میں ہوتی۔ اور قائد اعظم "مسلم لیگ کے صدر کے بجائے مسلمانانِ ہند کے واحد نمائندہ" کی حیثیت سے انگریز اور ہندو سے بات کرتے۔

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ پاکستان میں سیاسی پارٹیاں ختم کر دینی چاہئیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حکومت ایک پارٹی کی ہونی چاہیئے۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہاں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ حکومت مسلم لیگ پارٹی کی ہونی چاہیئے۔ اور دوسری پارٹیاں ختم کر دینی چاہئیں۔ اس تجویز کی سب سے پہلے جس نے مخالفت کی تھی وہ طلوع اسلام تھا۔ اس نے برملا کہہ دیا تھا کہ

> صرف ایک ہی پارٹی کا وجود آمریت کا دوسرا نام ہے۔ اٹلی، جرمنی اور روس میں یہی صورت حال تھی یہاں۔ چنانچہ یہ حکومتیں خالصۃً آمرانہ رہی ہیں۔ (طلوع اسلام۔ جون ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۳۹)

اور اس نظریہ کے خلاف تفصیلی بحث کے بعد کہا تھا کہ

> صراطِ مستقیم یہ ہے کہ کوئی سیاسی جماعت نہ ہو اور ملت کے تمام افراد ایک دوسرے کے ممد و معاون بن کر تشکیل حکومت کریں۔ کوئی ایک فرد بھی اس نظام سے خارج نہ ہو۔ وہ اپنی امکانی قدرت کے مطابق نظام میں شریک ہو اور نظام اس کا ضامن ہو کہ اس کے امکانات کے کما حقہٗ اظہار کے مواقع مہیا کئے جائیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۳)

اسی نظام کا طلوع اسلام آج بھی داعی ہے۔ اصل یہ ہے کہ چونکہ ہمارا ذہن، مغربی نظامِ جمہوریت کی تنگ نائے سے باہر نکل نہیں سکتا اس لئے ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ پارٹیوں کے بغیر جمہوری نظام چل سکتا ہے۔ اگر ہم قرآنی نظام کو سمجھ لیں تو پھر پوری ملت کی مشترکہ حکومت کے تصور کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس وقت یہ بات بھی بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مغرب کا جمہوری نظام جس میں کم از کم دو پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوتا ہے، کس طرح قرآنی نظام کے خلاف ہے۔

سیاسی پارٹیوں کے سلسلہ میں دو ایک باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ان کی ایک شکل وہ ہے جس طرح ہمارے ہاں مسلم لیگ۔ عوامی لیگ۔ مجلسِ احرار۔ سرخ پوش وغیرہ سیاسی پارٹیاں تھیں۔ یہ پارٹیاں تعصب اور منافرت میں مذہبی فرقوں سے کسی صورت میں کم نہیں ہوتیں۔ یہ ملت کی وحدت کو (مذہبی فرقوں کی طرح) پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ ان کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے فرعون کی "فردِ جرم" میں اسے سرفہرست رکھا ہے کہ اس نے ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

پارٹیوں کی دوسری شکل وہ ہے جس کا مظاہرہ پارلیمانی نظامِ حکومت میں ہوتا ہے۔ پارلیمان میں اکثریت کی پارٹی حکومت قائم کرتی ہے اور اقلیت کی پارٹی اس کے مدِ مقابل (حزبِ مخالف) بن کر ڈٹ جاتی ہے۔ اس پارٹی کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ ہر معاملہ میں حکومت کی مخالفت کی جائے۔ اور مقصد یہ کہ کسی نہ کسی طرح اس پارٹی کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی

جائے۔ اس قسم کا نظام جس میں ملت یوں گروہوں میں بٹ جائے اور پھر یہ گروہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہیں، اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا پارلیمانی نظام اسلامی تصورِ سیاست میں کبھی بار نہیں پا سکتا۔ اسلامی نظام میں نہ حکومت کسی ایک پارٹی کی ہوتی ہے اور نہ ہی حکومت کی نگرانی کا فریضہ کسی پارٹی کے سپرد ہوتا ہے۔ اس میں اقامتِ حکومت ملت کا مشترکہ فریضہ ہوتا ہے اور ہر فرد حکومت کے کاروبار کی نگرانی کرتا ہے۔ پارلیمان میں جتنے امور زیرِ بحث آتے ہیں ان میں سب سے بڑی اور بنیادی نگرانی اس اصول کی ہوتی ہے کہ مملکت کا کاروبار قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر ہوگا۔ ان اصولوں کے اندر رہتے ہوئے جزئیات کی تدوین اور طریق کار کی تعیین کے بارے میں اختلاف آراء ہو سکتا ہے۔ اظہارِ آراء کا حق پارلیمان کے اندر اور اس کے باہر تمام افرادِ ملکت کو یکساں طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ان مسائل پر بحث و تمحیص آزادانہ ہوتی ہے۔ لیکن جب زیرِ بحث مسئلہ آخری فیصلہ کے بعد قانون کی شکل اختیار کر لے اس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہر وقت موجود ہوتی ہے اور اس کے لئے آئینی طور پر کوشش کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل۔

تیسری شکل یہ ہے کہ ملت کی فلاح و بہبود سے متعلق کسی کام میں منظم کوشش کرنے کے لئے کوئی جماعت بنائی جائے۔ اس قسم کی اجتماعی کوشش "تعاون علی البر والتقویٰ" (برو تقویٰ کے امور میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے) کے ذیل میں آجائے گی اور اس کی ممانعت نہیں ہوگی، بشرطیکہ اس کا نصب العین، ملت کی طے کردہ پالیسی کے خلاف نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ صحیح اسلامی نظامِ معاشرہ میں اس قسم کی علیحدہ اور انفرادی جماعتوں کی بہت کم ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر کسی خاص مقصد کے لئے اس کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ہوگی۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اسلامی نظام کی بنیاد وحدتِ ملت ہے۔ اس میں تقسیم کار تو ضروری ہوگا لیکن تفریقِ بین الملت کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ حیرت ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ چھوٹی چھوٹی جزئیات میں اتباعِ سنتِ نبوی پر اس قدر زور دیتا ہے اور دین کے اس قدر بنیادی مسئلہ میں اتنا بھی نہیں سوچتا کہ اس دورِ ہمایوں میں نہ ملت میں کوئی مذہبی فرقہ تھا اور نہ سیاسی پارٹی۔ اگر ہمارے لئے آئیڈیل (اسوۂ حسنہ) اس دور کا نظام ہے (جو قرآن کی بنیادوں پر استوار تھا) تو پھر ہمارے ہاں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم پھر اس سوال کو دہراتے ہیں کہ کیا اس دور میں، ملت میں کوئی مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی تھی؟

آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات میں طلوع اسلام نے جس نظام کی سفارش کی ہے وہ نہ امریکہ کا صدارتی نظام ہے اور نہ یورپ کا پارلیمانی۔ وہ ان دونوں کا قابلِ عمل امتزاج ہے جس میں کسی پارٹی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح وہ نظام صحیح قرآنی نظام کی طرف پہلے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔

فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے سلسلہ میں نوائے وقت کے اتباع میں جماعت اہل حدیث کے ترجمان الاعتصام (لاہور) نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ، عبرتناک اور الم انگیز ہے۔ طلوع اسلام، پاکستان میں مسلسل تیرہ سال سے کہتا چلا آرہا ہے کہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔ اس نے حضرات علمائے کرام کو بار بار دعوت دی کہ وہ بتائیں کہ قرآن کریم کی نصوص صریحہ کی موجودگی میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کس طرح جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس اہم سوال کے متعلق ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ خود الاعتصام کی یہ حالت ہے کہ اس نے طلوع اسلام کی مخالفت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ لیکن اس نے اس مسئلہ پر آج تک طلوع اسلام کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ اس نے اس سوال کو اٹھایا ہے۔ اب دیکھئے کہ جب یہ مہر سکوت ٹوٹی ہے تو اس سے کس قسم کے "گہر ہائے آبدار" نکھرے ہیں۔ معاصر مذکور نے اپنی ۱۷ جون کی اشاعت کے افتتاحیہ میں بہ عنوان "ذہنی اور فکری انتشار کی انتہا" لکھا ہے۔

> پرویز صاحب نے پوری امت کو ایک پارٹی قرار دیا ہے اور اس کے اندر پارٹیوں کے وجود کو خواہ وہ مذہبی شکل میں ہوں یا سیاسی شکل میں شرک سے تعبیر فرمایا ہے اور لطف یہ ہے کہ اسے قرآن کی طرف منسوب کیا ہے۔ پرویز صاحب کا یہ فرمان ہم سب کے لئے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک قرآن کے جاننے والوں کا تعلق ہے ان میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ قرآن نے کہاں اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے وجود کو شرک ٹھہرایا ہے۔ مذہبی جماعتوں کا وجود نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے اور اس اثنا میں اسلام کو سمجھنے، پھیلانے اور مختلف اوقات میں اس کی نشر و اشاعت کو عام کرنے والے بے شمار افراد اور گروہ پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے کبھی کسی نے اس قسم کی بات نہیں کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان کی طرف سے کیا ارشاد ہو رہا ہے؟ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ قرآن نے مذہبی فرقہ پرستی کو کہاں شرک قرار دیا ہے؟ فرقہ بندی شرک نہیں، عین توحید ہے! فرمائیے! اس کے بعد آپ ان حضرات کا کیا کریں گے؟

"قرآن جاننے والوں" کی خدمت میں گذارش ہے کہ قرآن کریم نے سورۂ روم کی حسب ذیل آیت میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کو شرک قرار دیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)

اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ (یعنی) ان میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقہ فرقہ ہو گئے۔ ہر گروہ اس پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔

اور ان کے متعلق نبی اکرمؐ سے ارشاد فرمایا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ ... (۶/۱۵۹)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے، تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں۔

اور مسلمانوں سے تاکید کر دی کہ

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۳/۱۰۵)

تم نے ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور باہم گر اختلافات میں پڑ گئے۔ بعد اس کے کہ انکے پاس واضح احکام (یا دلائل) آچکے تھے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ

(۱) اگر مسلمانوں کے موجودہ مذہبی فرقے (سنی۔ شیعہ۔ اہل حدیث۔ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی وغیرہ) اس تفرقہ و تحزب و تشیع کے ماتحت نہیں آتے جن کا ذکر مندرجہ بالا آیات میں کیا گیا ہے تو وہ کون سے فرقے ہیں جن پر ان آیات کا اطلاق ہوتا ہے؟

(۲) کیا نبی اکرمؐ کے زمانہ میں امت میں مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں موجود تھیں؟ اگر مذہبی فرقے بعد میں وجود میں آئے تھے تو کیا انھیں (کم از کم) بدعت نہیں کہا جائے گا؟ کیا نبی اکرمؐ نے بھی فرقہ بندی سے منع نہیں فرمایا تھا؟

(۳) کیا کسی چیز کا پرانا ہو جانا اس کے جائز ہونے کی دلیل یا سند ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو پھر مسلمانوں میں جس قدر مشرکانہ عقائد و رسوم ایسے ہیں جو صدیوں سے مروج چلے آرہے ہیں سب جائز قرار پا جائیں گے؟

(۴) اگر مختلف فرقوں کا وجود اسلام میں ممنوع نہیں، تو ان فرقوں کے نمائندگان، ایک دوسرے کی تکفیر کیوں کرتے چلے آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک فرقہ اپنی مسجد میں دوسرے فرقہ والوں کو نماز تک نہیں پڑھنے دیتا۔

(۵) اگر مختلف فرقوں کا الگ الگ مساجد بنا لینا بھی ممنوع نہیں تو قرآن کریم میں جس مسجد کی تعمیر کو کفر اور ارصاداً لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب تھی (۹/۱۰۷) تو اس کی نوعیت کیا تھی؟

آگے چل کر الاعتصام لکھتا ہے کہ

ذہنی پریشانی۔ فکری انتشار۔ تضاد بیانی اور ناواقفیت کی انتہا ہے کہ پرویز صاحب یہی فرماتے

سلہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں "دین" میں مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں سب آجاتے ہیں۔

ہیں کہ قرآنی نظام میں آمریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور حکومت کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ پاکستان میں سیاسی جماعتوں پر مستقل طور پر پابندی عاید کر دینی چاہیئے۔ تعجب ہے کہ یہ موٹی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ملک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہو گی تو آمریت کیسے نہیں آئیگی؟

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا (مثلاً) حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ملک میں کوئی سیاسی جماعت موجود تھی؟ اگر نہیں تھی تو کیا ان کی حکومت آمریت تھی؟

پھر لکھا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی اور اہل حدیث وغیرہ کہلانا شرک ہے تو آپ کی یہ بزم طلوع اسلام کیوں شرک نہیں۔ یہ بھی تو ایک مستقل مکتب فکر ہے اور اس کا سب سے بڑا کام انکار حدیث ہے۔ بتایا جائے کہ یہ کس قرآن میں آیا ہے کہ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی کہلانا تو شرک ہے لیکن بزم طلوع اسلام سے وابستگی عین اسلام ہے؟

اس لئے کہ حنفی۔ مالکی۔ اہل حدیث۔ شیعہ۔ سنی وغیرہ مذہبی فرقے ہیں۔ اور بزم طلوع اسلام نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے نہ سیاسی جماعت۔ اس میں ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں اور اپنے اپنے طریق کے مطابق ارکان اسلام (نماز۔ روزہ وغیرہ) کی پابندی اور فقہی احکام کا اتباع کرتے ہیں۔ اس کی صحیح پوزیشن وہ ہے جس کے متعلق پرویز صاحب نے گذشتہ کنونشن میں، ان الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ

جہاں تک اس قرآنی فکر کا تعلق جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اس کی بابت اچھی طرح سے سمجھ لیجئے گا کہ اگر آپ اس فکر کو اس لئے صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ میری فکر ہے۔ یعنی آپ کے پاس اس کے صحیح ہونے کی سند یہ ہے کہ ایسا پرویز صاحب کہتے ہیں تو یاد رکھیے کہ آپ نے نہ قرآنی فکر کو سمجھا ہے اور نہ اس تحریک کو۔ قرآنی فکر کے لئے نہ پرویز صاحب سند ہو سکتے ہیں نہ کوئی اور انسان۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآن کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس طرح غور و فکر کے بعد اسے صحیح سمجھتے ہیں تو اسے صحیح مانئے۔ آپ کا ماننا اس طرح صحیح ماننا میری سند سے نہیں ہو گا بلکہ براہ راست قرآن کریم کی سند سے ہو گا۔ اسے اچھی طرح سن رکھیے جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں قرآن کریم کے بجائے کسی انسان کو سند مان لیا آپ نے فرقہ پرستی کی بنیاد رکھ دی۔ اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے سخت شرک ہے۔

(طلوع اسلام۔ مئی جون سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۲)

ہم قارئینِ طلوعِ اسلام سے معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے ان کا وقت ایک ایسے سوال کے جواب میں لے لیا جس کے متعلق قرآن پر ایمان رکھنے والوں کے دل میں ذرا سا شبہ بھی نہیں گذر سکتا۔ لیکن ہم نے اسے ایک تو اس لئے ضروری سمجھا کہ الاعتصام جماعتِ اہلِ حدیث کا ترجمان ہے جو مذہبی فرقوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ قارئینِ طلوعِ اسلام کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے مذہبی طبقے ضد اور تعصب میں کہاں تک چلے جاتے ہیں۔ اور قرآن کریم کے متعلق ان کا علم و ایمان کس انداز کا ہے۔ الاعتصام نے ابھی تو اتنا ہی پوچھا ہے کہ بتاؤ وہ کونسا قرآن ہے جس میں فرقہ پرستی کو شرک قرار دیا ہے۔ عجب کیا کل کو اس کی طرف سے یہ بھی پوچھا جائے کہ بتاؤ وہ کون سا قرآن ہے جس میں لکھا ہے کہ خدا ایک ہے ——— ہم نے یہ بات طنزاً نہیں کہی۔ ایک حقیقت کو بیان کیا ہے۔ عملاً یہ حضرات خدا کو ایک نہیں مانتے۔ کوئی فرقہ پرست کبھی عملاً خدا کو لاشریک نہیں مانتا یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ پرستی کو شرک قرار دیا ہے۔ خدا کو عملاً ایک ماننے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی کتاب کے ضابطۂ حیات اور قانونِ زندگی ہونے کو لاشریک مانا جائے۔ لیکن فرقہ پرستی کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہوتی ہے کہ قرآن کے ساتھ "مثلہٗ معہٗ" کچھ اور بھی ہے۔ اور وہ "اور" نہ صرف مثلاً (قرآن کی مثل) ہے بلکہ قرآن پر اضافہ بھی کر سکتا ہے اور اسے منسوخ بھی۔

پریس کانفرنس

طلوعِ اسلام کی طرف سے آئینی کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات شائع ہونے کے بعد ملک کے اطراف و جوانب سے، مختلف نکات کی توضیح و تشریح کے لئے اس قدر استفسارات موصول ہوئے کہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کا فرداً فرداً (جواب دینے کی بجائے) پرویز صاحب پریس کانفرنس سے خطاب کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے دس جون کی شام کو پریس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں (اردو اور انگریزی) اخبارات کے نمائندگان کے علاوہ ریڈیو پاکستان اور ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندگان بھی شریک تھے۔ قریب تین گھنٹے تک یہ اجتماع نہایت پرسکون اور باوقار فضا میں مصروفِ انہام و تفہیم رہا۔ پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام تحریک کا پس منظر بیان کرنے کے بعد اس کے بنیادی اصولوں کی تشریح کی اور اسلامی آئین اور قرآنی نظام کے نمایاں خط و خال کو بڑی وضاحت سے بیان کیا۔ اس کے بعد ان سے نہایت سنجیدہ سوالات بھی پوچھے گئے جن کا اطمینان بخش جواب دیا گیا۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ یہ احباب کانفرنس سے ہر نوع مطمئن اٹھے۔ البتہ ایک سوال ایسا تھا جس کے مستفسر نے عدمِ اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ سوال یہ تھا کہ غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں مسلمانوں جیسی پوزیشن کیوں نہیں دی جا سکتی؟

غیر مسلموں کی پوزیشن

صورت یہ ہے کہ (۱) مطالبہ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔ یہ دونوں مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے نہ کہ وطنی اشتراک۔

(۲) ہندوستان میں ایسے مسلمان موجود تھے جو قومیت کے متعلق اسلام کے اس نظریہ کے قائل نہ تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم کے افراد مانتے تھے۔

(۳) اب یہی لوگ پاکستان میں موجود ہیں اور اپنے اُسی سابقہ نظریہ پر قائم۔ حالانکہ اصولاً انہیں چاہیئے یہ تھا کہ یا تو اپنے سابقہ نظریہ کو بدل کر اس نظریہ کو قبول کر لیتے جس پر پاکستانی مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ تھا تو پھر پاکستان میں نہ رہتے۔

(۴) یہی وہ لوگ ہیں جو آئے دن اس قسم کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں کہ اگر ہم غیر مسلموں کو شریکِ امورِ مملکت نہ کریں تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ غیر مسلم ہماری قوم کے افراد ہیں۔ ان میں اور مسلمانوں میں تفریق کرنا عدل و مساوات کے منافی ہے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر ملک میں ایسے لوگ بستے ہیں جو اس ملک کے نیشنل (وہاں کی قوم کے افراد) نہیں ہوتے۔ کوئی مملکت ان لوگوں کو نہ اپنا ہم قوم سمجھتی ہے۔ نہ شریکِ مملکت کرتی ہے۔ یہ صورت عام ممالک میں ہوتی ہے لیکن جہاں مملکت کا وجود کسی آئیڈیالوجی پر متشکل ہو وہاں یہ تفریق اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت یہ پوزیشن ہے۔ وہ ہماری قوم کے افراد نہیں۔ وہ اس قوم کے افراد ہو نہیں سکتے جب تک اسلامی آئیڈیالوجی پر ایمان نہ لے آئیں۔ لہٰذا انہیں اس ملک میں وہی کچھ مل سکتا ہے جو کسی ملک میں "غیر اقوام" کے افراد کو ملتا ہے۔

یہ کہنا کہ انصافی ہے دیدہ ودانستہ حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ ہم تحریکِ پاکستان کے دوران میں کامل دس برس تک اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ یہ غیر مسلم جو اس وقت پاکستان میں ہیں دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ ہمارے اس دعویٰ کی مخالفت کرتے رہے۔ انہیں شکست ہوئی اور پاکستان وجود میں آگیا۔ جو غیر مسلم اس کے بعد پاکستان میں رہے (یا پاکستان کی طرف منتقل ہو کر آئے) انہیں اچھی طرح علم تھا کہ وہ پاکستان کے مسلمانوں کے ہم قوم نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی اس پوزیشن سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد یہاں رہے۔

اب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر انہیں مسلمانوں کا ہم قوم نہ سمجھا جائے تو یہ بڑی بے انصافی ہے اور اس کے جواب سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔ آپ فرمائیے کہ اگر کسی شخص کے لئے یہ بات وجۂ عدمِ اطمینان ہو جائے (کہ غیر مسلموں کو مسلم قوم کے افراد کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا) تو ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ ان کا اطمینان تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے کہیں کہ

> حضور! تحریکِ پاکستان کے دوران جب آپ کہتے تھے کہ ایک ملک میں رہنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں تو آپ کا ارشاد بالکل بجا اور درست تھا۔ ہمارا دعویٰ محض پولیٹیکل سٹنٹ (POLITICAL STUNT) تھا۔ اور جب ہم کہتے تھے کہ ہم اسلام کی رُو سے ایسا

> کہنے پر مجبور ہیں تو یہ بھی سیاسی فریب تھا۔ اب پاکستان بن گیا۔ اب اس فریب دہی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے ہمیں تسلیم ہے کہ پاکستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں۔

طلوع اسلام تو یہ کہہ نہیں سکتا۔ اس لئے ان حضرات کو مطمئن کر دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے نزدیک قرآن کریم کی رو سے مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قوموں کے افراد ہیں۔ خواہ وہ تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں ہوں یا تقسیم کے بعد پاکستان میں۔

طلوع اسلام سیاسی جماعت نہیں

پریس کانفرنس میں تحریک طلوع اسلام کے متعلق بھی دو ایک اہم باتوں کی وضاحت کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ طلوع اسلام جس طرح کوئی مذہبی فرقہ نہیں اسی طرح یہ کوئی سیاسی جماعت نہیں۔ اس نے نہ اپنی سیاسی جماعت بنائی ہے اور نہ آج تک کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہوا ہے۔ نہ ہی اس نے ملک کی عملی سیاست میں کبھی حصہ لیا ہے اور نہ آئندہ عملی سیاست میں حصہ لینا اس کے پروگرام میں داخل ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ زندگی کے جو مسائل سامنے آئیں ان کے متعلق بتایا جائے کہ قرآن کریم کی اس باب میں کیا تعلیم ہے اور چونکہ زندگی کے مسائل میں، معاشرتی، تمدنی، معاشی، سیاسی، عائلی، ہر قسم کے مسائل شامل ہوتے ہیں، اس لئے یہ ان تمام امور پر قرآن کریم کی روشنی میں گفتگو کرتا اور اس قرآنی فکر کو عام کرتا ہے۔ اس کا ایمان یہ ہے کہ غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار قرآن کریم ہے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہے وہ حق ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے وہ باطل ہے۔

طلوع اسلام اور حکومتوں کی تعریف

دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ طلوع اسلام ہر اس بات کی تائید کرتا ہے جو قرآن کریم کے مطابق ہو۔ خواہ وہ بات کسی فرد، پارٹی، گروہ یا حکومت کی طرف سے آئے۔ اور اس کی مخالفت کرتا ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔ خواہ وہ کسی فرد، پارٹی یا گروہ کی طرف سے آئے۔ پاکستان میں گذشتہ تیرہ سال میں مختلف افراد اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہوئے۔ مختلف پارٹیوں نے حکومتیں بنائیں۔ مختلف حکومتیں وجود میں آئیں اور ختم ہو گئیں۔ چونکہ اکثر ہوتا یہی رہا ہے کہ جو فرد یا پارٹی برسر اقتدار آئی اس نے نظریۂ پاکستان، اسلامی آئیڈیالوجی، اسلامی جمہوریت، اسلامی نظام کی تائید میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا۔ اس لئے طلوع اسلام کی طرف سے ان کے اس بیان کی تائید کی۔ لیکن جب انھوں نے کوئی بات ایسی کی جو طلوع اسلام کے نزدیک قرآنی نظریۂ زندگی کے خلاف تھی تو اس نے فوراً اس کی مخالفت کی اور ایسا کرنے میں بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی رعایت نہیں برتی۔

اب اگر کوئی شخص "یہ ثابت کرنا" چاہے کہ طلوع اسلام ہر برسر اقتدار حکومت یا پارٹی (یا افراد) کی تعریف کرتا رہا ہے تو اسے طلوع اسلام کی فائلوں سے اس کے لئے مسالہ مل جائے گا۔ وہ اس طرح کہ وہ ان تمام اقتباسات کو یکجا کر لیگا جو مختلف حکومتوں یا پارٹیوں کے کسی بیان یا فیصلہ کی تائید میں طلوع اسلام میں شائع ہوئے۔ اور جو کچھ طلوع اسلام نے

ان کے خلاف لکھا اسے دبا لے گا۔ اس کے برعکس، اگر کوئی شخص یہ "ثابت کرنا چاہے کہ طلوع اسلام نے ہر حکومت کی مخالفت کی ہے" تو اسے اس کے لئے بھی مسالہ مل جائے گا۔ وہ ان تمام اقتباسات کو یکجا کر لے گا جو طلوع اسلام کی طرف سے مختلف حکومتوں، پارٹیوں یا افراد کے خلاف لکھا جاتا رہا اور جو کچھ اس نے ان کی تائید میں لکھا تھا اسے پس پشت ڈال دے گا۔ اس کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ طلوع اسلام کے بعض مخالفین اس قسم کے کمینہ حربوں تک پر بھی اتر آتے ہیں۔

ذاتی مفاد اس کے بعد پرویز صاحب نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ انھوں نے آج تک نہ طلوع اسلام کے مشن کے لئے اور نہ ہی اپنی ذات کے لئے کسی پارٹی یا حکومت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی امداد حاصل کی ہے نہ کوئی رعایت۔ نہ ملازمت کے سلسلے میں نہ اس سے باہر۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب طلوع اسلام کسی خلاف قرآن بات کی مخالفت کرتا ہے تو اس میں کسی شخصیت، پارٹی یا حکومت کا خیال اس کا دامن کش اور گلوگیر نہیں ہوتا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ قرآن پیش کرنے کے لئے یہ بنیادی شرط ہے۔

اعتذار۔ طلوع اسلام کا سابقہ پرچہ جو مئی اور جون کا مشترکہ شمارہ تھا، وسط مئی میں شائع ہوا تھا۔ ماہ جون میں بزم قارئین سے ہماری غیر حاضری اکثر قارئین پر گراں گذری۔ ہم ان کے لئے اس قلبی تعلق کے لئے شکر گذار ہیں اور اپنی مجبوری کے لئے معذرت خواہ۔

(۲) زیر نظر شمارہ میں، دو نہایت اہم مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ایک کتاب و سنت کی صحیح پوزیشن کے متعلق اور دوسرا ضبط ولادت کے سلسلہ میں۔ دونوں مضامین اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ گہرے غور و تدبر سے کیا جائے۔ ان مضامین کے پمفلٹ بھی شائع کئے گئے ہیں جن کی عام اشاعت کی ضرورت ہے۔

(۳) ان مبسوط مضامین کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیگر مضامین کے لئے پرچہ میں گنجائش نہیں رہی۔ چنانچہ ضخامت بڑھانے کے باوجود بہت سے اہم مقالات و شذرات کتابت شدہ پڑے ہیں۔ یہ آئندہ اشاعتوں میں سامنے آسکیں گے۔

(۴) للہ الحمد کہ لغات القرآن کی دوسری جلد کی طباعت اطمینان بخش رفتار سے ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ دو تین ماہ تک چھپ جائیگی۔

(۵) علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی مایہ ناز تصنیف "فجر الاسلام" کا اردو ترجمہ ضخیم کتاب کی شکل میں چھپ گیا ہے۔ امید ہے کہ وہ اسی ماہ شائع ہو جائے گا۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ "اسلام کی سرگزشت" کے عنوان سے طلوع اسلام میں مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ پیشگی خریداران میں سے اگر کوئی صاحب اسے منگانا چاہیں تو براہ کرم ۔ ۲۰ جولائی تک مکتبہ طلوع اسلام کو اطلاع دے دیں۔ (تمام کتابیں اب مکتبہ سے جاری ہوتی ہیں نہ کہ ادارہ سے)۔

محترم پرویز صاحب کا آئندہ دورہ کراچی موجودہ فیصلہ کے مطابق محترم پرویز صاحب جولائی کے دوسرے ہفتہ میں کراچی تشریف لے جائیں گے۔ وہاں کی بزم ان کے لیکچرز اور درس قرآن کا انتظام کر رہی ہے۔ بزم کا پتہ۔ میاں عبد الخالق صاحب، نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ ۸۵ (پی۔ ایم۔ اے بلڈنگ) نکل روڈ۔ کراچی۔ ہے۔

آئینِ پاکستان اور علمائے کرام

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں کہ دنیا بھر کے مختلف طبقات کے انسان کسی نہ کسی اہم بات پر متفق ہو جائیں گے لیکن ہمارے مذہبی پیشوا کسی ایک نقطہ پر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ جو حضرات تیرہ سو سال میں اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں یا باندھنے چاہئیں۔ اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس مقام پر وہ زندگی کے کسی اہم معاملہ میں کس طرح متفق ہو سکتے ہیں؟ لیکن جب سنہ ۱۹۵۶ء کا آئین زیرِ ترتیب تھا تو ملک اور قوم کو یقین دلایا گیا کہ یہ مسلمہ غلط ہے۔ مختلف فرقوں کے اکتیس علماء نے آئین کے متعلق اپنا متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے اس "اتحاد و اتفاق" کا ڈھنڈورا پیٹنے میں (سابق) جماعت اسلامی سب سے پیش پیش تھی حالانکہ انہی علمائے کرام کے متعلق، اس جماعت کے امیر اس سے بہت پہلے حسب ذیل فتویٰ صادر فرما چکے تھے کہ

> یہ حضرات چونکہ اس طبقہ کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں ان مسائل کے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانئے دن بدن دلوں میں سر پھٹول ہو گی۔ اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا الگ الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اس نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے ڈنک مارے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے اور جس حجروں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہاں دین کے مباحث اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں جمع ہو کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہو گی۔

(تنقیحات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۵۸-۵۹)

طلوع اسلام واضح طور پر بتاتا رہا کہ ان اکتیس علماء کے متفقہ مطالبہ کی حیثیت کیا ہے۔ لیکن چونکہ اس مطالبہ کے پیچھے ایک خاص مقصد کارفرما تھا وہ آئین میں شامل کر لیا گیا اور اس کے منظور ہونے پر ملک میں جشن مسرت منایا گیا کہ "مملکت مسلمان ہو گئی ہے"!

وہ دور ختم ہو گیا۔ اب پھر پاکستان کے لئے ایک نئے دستور کی تدوین کا سوال زیر غور ہے۔ آئین کمیشن نے اپنا سوالنامہ شائع کیا ہے جس کے جوابات حضرات علمائے کرام کی طرف سے بھی گئے ہیں۔ آپ ان جوابات کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ جس اتحاد و اتفاق کا یوں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ اس کی ہنڈیا کس طرح چوراہے میں پھوٹی ہے۔ ان سطور کے لکھتے وقت تک ہمارے سامنے علماء کے صرف تین گروہوں کے جوابات آئے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تین گروہ، تین "مسلمہ فرقوں" کے الگ الگ نمائندے نہیں بلکہ مشترک نمائندے ہیں۔ سب سے پہلے شروع مئی میں لاہور میں "انیس علماء" جمع ہوئے جن میں مفتی محمد حسن، مفتی محمد شفیع، مولانا ابو الحسنات احمد، مولانا داؤد غزنوی۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہم شامل تھے۔ دوسرا جواب چالیس علماء کرام کی طرف سے "نظام العلماء" کے نام سے ہے اور ان میں مولانا احمد علی، مولانا میرک شاہ، مولانا عبد القیوم پوپلزئی۔ مولانا سید گل بادشاہ اور علامہ خالد محمود شامل ہیں۔ اس کے بعد تیسرا جواب سامنے آتا ہے۔ یہ اگرچہ بظاہر مولانا امین احسن اصلاحی کی طرف سے ہے لیکن یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ یہ جواب بھی ایک مخصوص مذہبی گروہ کے فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی اس جماعت کی جو مودودی صاحب کی جماعت سے کٹ کر الگ ہوئی ہے۔

مولانا اصلاحی کا اختلاف

اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انیس[(۱۹)] علماء کے جواب شائع ہونے پر جب مولانا اصلاحی نے اپنے جوابات کو شائع کیا تو ان کے ساتھ ایک وضاحتی نوٹ بھی شامل تھا۔ اس میں اصلاحی صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ

> لاہور سے چند علماء کے نام سے جو جواب شائع ہوا اس پر مجھ سے بھی دستخط کرنے کی خواہش کی گئی۔ لیکن چونکہ اس جواب کے بیشتر حصہ سے مجھے اتفاق نہیں تھا۔ اس وجہ سے میں نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔　　　　(المنبر۔ ۳ جون)

اس کے ساتھ وہ مزید یہ بتاتے ہیں کہ

> میرا نقطہ نظران حضرات سے اتنا مختلف تھا کہ ان کے ڈرافٹ پر بیسیوں جگہ انگوٹھا لگا دیتا۔ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک میں اپنے علم اور اپنے ضمیر کی مخالفت کرنے پر کمر کھول آمادہ نہ ہو جاؤں اور اس قسم کے عدم اتفاق کا اظہار کرنے میں میں تنہا ہی نہیں تھا بلکہ اور بھی ذی فہم اور ذی علم حضرات تھے۔　　　　(ایضاً)

علماء کے اجماع کی حقیقت

"انیس علماء" کے جواب کی اشاعت پر اس کے حامی اخبار نے علمائے کرام کا ایک

تاریخی کارنامہ" کے عنوان سے ایک اداریہ میں لکھا کہ اس جواب کو "علماء کے اجماع" کی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر اصلاحی صاحب کے گروہ کے ترجمان نے اپنے اداریہ میں "بڑے اجمال اور اشارات کے انداز میں" جو کچھ تحریر فرمایا وہ بھی سن لیجئے۔

> دامن احتیاط کو تھامتے ہوئے ہم آج کی صحبت میں صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس جواب کو علماء کے اجماع کی حیثیت دینا نہ صرف غلط ہے بلکہ یہ کوشش ایک اہم دینی اصطلاح کو غلط معنی پہنانے کے مترادف ہے جس سے اس لفظ کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ (المنبر۔ ۲۰ مئی)

لیکن اسی بات پر اکتفا نہیں ہو سکا۔ چنانچہ چند سطور آگے بڑھ کر یہ اخبار لکھتا ہے۔

> پھر اس بیان (اکیس علماء کے جواب) کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کے بارے میں ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ اگر انہیں متانت و سنجیدگی اور خدا ترسی سے زیر بحث لایا جائے اور اس کے حقیقی مضمرات واضح کئے جائیں تو اس مجلس کے متعدد راسخ العلم بزرگ بھی اس بیان کو منسوخ قرار دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

اور سنیئے! آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

> ہمارے نزدیک اس بیان کے اکثر حصوں کا لب و لہجہ نادرست ہے۔ بعض واقعات کی تعبیر میں بخت پن کے عیب سے معیوب ہے۔ بعض مسائل پر ترمیم طلب رائے ظاہر کی گئی ہے۔ بعض مشورے نامناسب ہیں۔ بعض ادعا خلاف واقع ہیں۔ بعض دھمکیاں اس مجلس کے وقار کے خلاف ہیں۔ بعض حقائق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ (ایضاً)

یاد رکھیے کہ ابھی یہ سب کچھ "اجمال اور اشارات میں" کہا گیا ہے۔ شاید تفصیل اور وضاحت بھی جلد ہی سامنے آ جائے۔

سابق دستور کے متعلق

اب آئیے علماء کے ان مختلف عناصر کے جوابات کی طرف!

سب سے پہلے سابق دستور کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیجئے۔ (واضح رہے کہ ان مذہبی پیشواؤں کی طرف سے یہ نقطہ ہائے نظر اسلام کی نمائندگی کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں)۔ ہم اس سلسلہ میں اصل اقتباسات کو بجنسہٖ پیش کر رہے ہیں۔ اکیس علمائے کرام کی رائے سنیئے!

> اگرچہ ہم سابق دستور کی دفعات ۱۹۳۔ اور ۱۹۴ کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں اور ان کی اصلاح ہمارے نزدیک ضروری ہے۔ مگر سردست ہماری رائے یہی ہے کہ سابق دستور جوں کا توں بحال کیا جائے۔ اور اس کی ترمیم و اصلاح کا کام عوام کی نمائندہ اسمبلی پر چھوڑ دیا جائے۔ (تسنیم ۔ ۱۰ مئی)

اس سلسلے میں "نظام العلماء" نے اپنا نقطۂ نظر یوں واضح فرمایا ہے۔

> ۱۹۵۶ء میں مجبوراً اسلام کے نام پر ایک دستور مرتب کیا گیا مگر افسوس کہ اس میں بھی اسلام کے نام

کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسلامی حکومت کے جس آئین میں مسلمانوں کو مرتد ہونے سے روکنے کے لئے کوئی ضمانت نہ ہو بلکہ شخصی آزادی کی پُرفریب اصطلاح کی آڑ میں ہر شخص کو ارتداد کی اجازت دی گئی ہو اور اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو مان کر آخری فیصلہ کا اختیار اسمبلی کی اکثریت کو دے دیا گیا ہو اور جس میں اس امر کی کوئی ضمانت نہ ہو کہ اس کا صدر اور وزیر اعظم صحیح العقیدہ اہل سنت والجماعت مسلمان ہوگا اس کو اسلامی آئین کہنا بڑی جسارت ہے۔ اس دستور میں اسلام کے نام کو بہت استعمال کیا گیا مگر جسٹس منیر کے بیان کے مطابق اس دستور میں کتاب و سنت کے تذکرے کے سوا کوئی اسلامی خصوصیت نہیں تھی (آفاق۔ ۸ جون)

تیسرے مکتب فکر (اصلاحی صاحب) کا خیال بھی اس بارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

یہاں انگریزی نظام یا امریکی دستور کی نقالی کرنے یا سابق دستور کی طرح کفر اور اسلام کا ایک مرکب دستور بنانے کی بجائے سو فیصدی ایک اسلامی دستور بنایا جائے۔ (المنبر۔ ۸ جون)

یعنی جس آئین کے منظور ہونے پر پہلے شادیانے بجائے گئے تھے اور جسے اکتیس علماء کے متفقہ مطالبہ کا نتیجہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے!

ماضی کے اسباب ناکامی کا سدباب

اب سوال رہتا ہے کہ سلسلہ میں (کہ ماضی کی صورت حال اور اس کے اسباب کو روکنے کی تجاویز کیا ہیں) سب سے پہلے انہیں علماء کی رائے سنئے۔

عملاً جو اقدام ہونا چاہیئے وہ یہ نہیں ہے کہ ملک کا آئین ایک کمیشن بنائے اور پھر مجلس وزراء اس کو بترمیم یا بلا ترمیم منظور کر کے نافذ کر دے بلکہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ ملک میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طریقے سے وہ انتخابات عام منعقد کئے جائیں جو فروری سنہ ۱۹۵۹ء میں ہونے والے تھے۔ پھر ملک کے جو نمائندے منتخب ہو کر آئیں انہیں سنہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے مطابق ہی اختیارات کی وہ امانت سونپ دی جائے جو اکتوبر ۱۹۵۸ء سے اب تک گویا معطل بنی ہوئی ہے اور انہی پر یہ بات چھوڑ دی جائے کہ دستور میں جس ترمیم کی ضرورت ہو وہ باشندوں کی مرضی کے مطابق کریں۔ (تسنیم۔ ۸ مئی)

"نظام العلماء" کا خیال ملاحظہ ہو۔

واضح الفاظ میں اعلان کیا جائے کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام اور اہل سنت والجماعت کا مسلک ہوگا ۔۔۔۔ تمام بد عقیدہ اور متعصب سیکرٹری اور عہدیدار علیحدہ کر دیئے جائیں جن سے کروڑوں رعایا کے جذبات مجروح ہوئے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ (وغیرہ وغیرہ) (آفاق۔ ۸ جون)

اس سلسلہ میں اصلاحی صاحب نے ایک تجویز بھی پیش کی ہے۔

اگر کمیشن یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایک صحیح اسلامی دستور کے بنیادی اصول کیا ہیں تو اس کا آسان راستہ یہ

ہو سکتا ہے کہ جنوری سنہ ۵۹ء میں اس ملک کے مختلف مکتب خیال کے علماء نے متفقہ طور پر جو اصول طے کر دیئے تھے وہ ان کو سامنے رکھ لے۔ اور اگر اس کے بعد بھی کچھ مسائل باقی رہ جائیں تو وہ ملک کے جید اور صاحب فکر علماء سے تبادلہ خیال کر کے یا ایک سوالنامہ کے ذریعے اہل علم کی رائیں معلوم کر کے طے کئے جا سکتے ہیں۔ (المنبر۔ ۳ر جون)

صدارتی اور پارلیمنٹری نظام صدارتی اور پارلیمنٹری نظام میں سے کسی ایک کے انتخاب سے متعلق جو سوال پوچھا گیا اس کے جواب میں "انیس علماء" فرماتے ہیں۔

اسلام میں صدارتی طرز حکومت اور پارلیمنٹری طرز حکومت دونوں مباح ہیں اور دونوں کی یکساں گنجائش ہے۔ اب یہ بات کہ ہم کونسا طرز اختیار کریں اس امر پر موقوف ہے کہ ہمارے حالات کے لحاظ سے موزوں تر نظام کون سا ہے۔ (تسنیم۔ ۱ر مئی)

"نظام العلماء" کی رائے اس بارے میں یہ ہے

نظام العلماء برطانوی جمہوری پارلیمانی نظام کی سفارش کرتا ہے۔ اور نہ ہی امریکی طرز کی صدارتی حکومت کی، بلکہ مدنی طرز خلافت کی پیروی کو سرمۂ چشم بصیرت بنانے کی تجویز کرتا ہے۔ (آفاق۔ ۳ر جون)

اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا گیا ہے۔

اسلام میں قانون سازی کا حق کسی کو نہیں۔ کتاب و سنت اور فقہی احکام کو نافذ کرنا حکومت کا کام ہے۔ البتہ امیر مجلس شوریٰ کے مشورہ سے احکام اسلام کے نفاذ کے قواعد مرتب کر سکتا ہے اور طرعیہ کے سوا دیگر تمام انتظامی امور اور سلطنت کے کاروبار کے لئے بھی قواعد و ضوابط وضع کر سکتا ہے۔ (ایضاً)

یہ وہی جواب ہے جو منیر کمیٹی میں دیا گیا تھا۔ یعنی اسلامی حکومت میں کسی قانون بنانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ تمام قوانین پہلے سے بنے بنائے موجود ہیں۔ حکومت کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کو نافذ کر دے۔

اصلاحی صاحب کا جواب بھی سن لیجئے!

ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے ساتھ ان میں سے کسی کا بھی میل نہیں ہے..... یہ دونوں نظام مختلف پہلوؤں سے اسلامی نظام سے اس قدر بے جوڑ ہیں کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا کوئی ارادہ ہو تو ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(المنبر۔ ۳ر جون)

وفاقی اور وحدانی طرز حکومت اب وفاقی اور وحدانی طرز حکومت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا سوال سامنے آتا ہے۔ "انیس علماء" کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا کہ

سنہ ۱۹۵۶ء کے دستور میں آزادانہ مباحثہ کے بعد ملک کے مختلف حصوں کے نمائندوں اور باشندوں کی مرضی سے وفاقی طرزِ حکومت اختیار کیا گیا تھا۔ اس لئے سرِدست اسی پر عمل ہونا چاہیئے۔

(تسنیم - ۱۰ رمئی)

نظام العلماء نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے۔

امیرِ مملکت مختلف صوبجات بنا سکتا ہے۔ مختلف صوبوں کے لئے گورنروں کو صوبائی مجالسِ شوریٰ نامزد کرنے کا اختیار دے سکتا ہے نیز ان علاقوں کے لئے مخصوص قواعد و ضوابط مرتب کرنے کا اختیار بھی دے سکتا ہے۔

(آفاق - ۳ رجون)

اصلاحی صاحب نے اپنی رائے یوں ظاہر فرمائی ہے۔

وفاقی یا وحدانی نظامِ حکومت کے جہاں تک جواز کا تعلق ہے۔ یہ دونوں ہی اسلام میں جائز ہیں سوال جو کچھ ہے وہ ہمارے مصالح کا ہے۔ ہمارے مصالح ان میں سے جس نظام کے لئے متقاضی ہوں وہ اختیار کیا جا سکتا ہے پاکستان کے لئے بربنائے مصالحت ہمارا رجحان وحدانی طرزِ حکومت کی طرف ہے۔

(المنبر - ۳ رجون)

طریقِ انتخاب

طریقِ انتخاب کے اہم سوال کو لیجئے!

• انہیں علماء کی طرف سے اس کے جواب میں کہا گیا ہے۔

درحقیقت یہ (مخلوط) طریقِ انتخاب پاکستان کے بنیادی نظریہ سے ٹکراتا ہے اور اس ملک کے لئے مہلک زہر کا حکم رکھتا ہے۔ اگر کمیشن ضرورت محسوس کرے تو ہم اس کے نقصانات کے متعلق پورا مواد فراہم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس قانون کے بجائے سابق طریقِ کار کے مطابق پہلے ملک کے عام انتخابات منعقد کئے جائیں اور طریقِ انتخاب کا آخری فیصلہ ملک کے نمائندے خود کریں۔

(تسنیم - ۱۰ رمئی)

غور کیجئے کس طرح اس سوال کو گول کر دیا گیا ہے کہ انتخابات جداگانہ طریق کے مطابق ہوں یا مخلوط طریق کے مطابق؟

نظام العلماء نے اپنے جواب میں واضح کیا ہے کہ

چونکہ اسلامی حکومت شرعی احکام پر مبنی ہوگی اس لئے اس کے بنانے اور چلانے والے صرف مسلمان ہو سکتے ہیں۔ بنابریں مخلوط یا جداگانہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (آفاق - ۴ رجون)

اصلاحی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے۔

پاکستان میں مخلوط طریقہ اختیار کرنا پاکستان کے بنیادی نظریہ کی نفی ہے۔ یہ غلطی اگر پہلے کی گئی ہے تو

اب اس کا اعادہ نہ کیا جائے۔ مخلوط طریقِ انتخاب مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بالکل غلط ہے اور سیاسی پہلو سے بھی پاکستان کے لئے سخت مضر ہے۔ (المنبر۔ ۳ جون)

بنیادی حقوق سابق آئین میں طے شدہ بنیادی حقوق کے متعلق بھی ایک سوال میں استصواب کیا گیا۔ انہیں علماء نے اس کے جواب میں واضح کیا کہ

سابق آئین میں جو بنیادی حقوق طے کئے گئے تھے ان کو جوں کا توں باقی رکھا جائے۔ سردست ان میں کوئی ردوبدل برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ (تسنیم۔ ۱۰ جون)

نظام العلماء نے جو رائے پیش کی ہے اس میں ترمیمی طور پر یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ

نظام العلماء اس میں حسبِ ذیل ترامیم ضروری سمجھتا ہے۔۔۔ پاکستان میں سوائے اس اسلام کے جو ما انا علیہ واصحابی پر مبنی ہے اور کسی کی تبلیغ کی اجازت نہ ہوگی اور نہ کسی مسلمان کو ما انا علیہ واصحابی والے اسلام داہلِ سنت سے نکلنے کی اجازت ہوگی۔

(آفاق۔ ۴ جون)

اصلاحی صاحب نے اپنا نقطۂ نظر یوں واضح کیا ہے۔

یہ بنیادی حقوق جو ہمارے سابق دستور میں ثبت ہوئے ہیں ایک لادینی ریاست کے لئے تو بالکل موزوں ہیں لیکن ایک اسلامی ریاست میں ان سے الجھنیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ان کی موجودگی میں شریعت کی بعض باتوں کا اجراء ولنفاذ دستور کے خلاف ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ہماری رائے یہ ہے کہ ان کے ساتھ یہ قید لگا دی جائے کہ یہ تمام حقوق اسلامی شریعت کے تحت ہوں گے۔

(المنبر۔ ۳ جون)

پریشاں خیالی یہ تو تھی مجوزہ آئین کے سلسلے میں تین مشہور مذہبی گروہوں کے باہمی اختلافات وانتشار کی ایک مختصری تصویر۔ اس کے ساتھ پریشاں خیالی کا ایک اور رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ محترم اصلاحی صاحب نے سوال ۱ کے سلسلے میں سیاسی استحکام کے لئے اپنے جواب میں یہ تجویز بھی پیش فرمائی ہے کہ

ملک میں ایک سے زیادہ ایسی منظم سیاسی پارٹیاں موجود ہوں جن کو اہلِ ملک کا اعتماد حاصل ہو جن کے لیڈر مضبوط ذہنی کردار کے حامل ہوں اور ملک کے ساتھ جن کی وفاداری ہر شبہ سے بالاتر ہو۔

(المنبر۔ ۳ جون)

اور پھر کچھ آگے بڑھ کر تیسرے سوال کے جواب میں یہ اسلامی نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں کہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ پارٹی سسٹم اصولاً اسلامی نظامِ حکومت کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام آگی

حوصلہ افزائی کرنے اور اس کو اپنے نظام حکومت کی بنیاد بنانے کے بجائے اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ (ایضاً)

ایک اور تجویز

انیس علماء نے اپنے جوابات کے آخری مرحلے پر ایک تجویز یہ بھی پیش کی ہے کہ صدر مملکت کا انتخاب دستور نافذ ہونے کے بعد ازسرنو ہونا چاہیئے۔

(تسنیم - ۱۰ مئی)

لیکن علمائے کرام کے کسی دوسرے گروہ نے اس کی تائید نہیں کی۔

مختلف جوابات کے اس سلسلہ کو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔ ملک کے اہم ترین دستوری مسائل کے متعلق کمیشن کے سوالنامہ کے ابتدائی چند سوالوں کے یہ جوابات ہیں اور یہ اُن لوگوں کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو اسلامی آئین کے بارے میں اپنے کامل اتفاق کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتے۔ عدم گنجائش کی بنا پر ان کے دیگر جوابات پیش کرنے کے بجائے ہمیں اختصار سے کام لینا پڑا۔ لیکن یہی اختصار یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جن حضرات میں ان چند اہم ترین اور بنیادی دستوری مسائل میں اختلاف و تضادات کی یہ شدید کیفیت موجود ہے وہ متحد کس بات پر ہو سکیں گے۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

آئین کے اصولی نکات سے ہٹ کر اب ہم ان حضرات کی طرف سے پیش کردہ اس تفصیل کا جائزہ لینا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو انہوں نے کمیشن کے ابتدائی سوالات کے سلسلہ میں اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے پیش کی۔ تاکہ یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ ملکی تاریخ کے گذشتہ واقعات وحقائق سے نتائج کے استنباط میں ان میں خلفشار و انتشار کی کس قدر گہری خلیج حائل ہے۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی برطرفی کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے "انیس علماء" کے جواب میں کہا گیا ہے

> اپریل سنہ ۱۹۵۳ء میں لاہور کے مارشل لاء کے دوران سیاسی لیڈروں سے ملازمین حکومت کی طرف انتقالِ حاکمیت کا پہلا قدم اٹھا اور وہ گورنر جنرل کی طرف سے دستور ساز اسمبلی کے لیڈر خواجہ ناظم الدین کی برطرفی تھی۔۔۔۔ لاہور کے مارشل لاء نے اس وقت جو حالات پیدا کر رکھے تھے ان کی وجہ سے باشندگانِ ملک اس پر کوئی احتجاج نہ کر سکے۔ اخبارات نے اپنی خیر منائی۔ اور یہ احساس کئے بغیر لے سراہا کہ ان کی قوم پھر آزادی سے غلامی کی طرف جا رہی ہے۔ ملازمین نے اس کا خیر مقدم کیا اور ان کے ضمیر نے انہیں یہ احساس نہ کرایا کہ وہ قوم سے تنخواہیں پاتے ہیں اور قوم ہی کے فراہم کردہ ذرائع و وسائل اور اسلحہ استعمال کر رہے ہیں۔ (تسنیم - ۱۰ مئی)

اب سنئے کہ اصلاحی صاحب اپنے جواب میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کیا لکھتے ہیں؟

> ہمارا یہ خیال نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا (گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کا) سروسز کے ساتھ کوئی ساز باز تھا۔ وہ نہ تو عام معنوں میں سروسز کے آدمی تھے اور نہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ ہم ان کے افعال کی ذمہ داری پاکستان کے سروسز کے لوگوں پر ڈالیں۔ (المنبر۔ ۳ جون)

"انہیں علماء" کے اسی حصہ جواب میں آگے چل کر کہا گیا ہے۔

> یہاں برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ سے نکلے ہوئے اختیارات کی امانت نہ آج تک باشندوں کو منتقل ہوئی نہ ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لئے انھوں نے کبھی اپنے نمائندے منتخب کئے اور نہ بھارت کے باشندوں کی طرح انہیں اپنی مرضی کی حکومت بنانے اور چلانے کا کوئی موقع ایک دن کے لئے بھی نصیب ہوا۔ اس کے بجائے یہاں تیرہ سال سے چند سیاسی لیڈروں اور ملازمین ریاست کے درمیان اقتدار کے لئے رسہ کشی ہوتی رہی ہے۔ (تسنیم ــــ ۱۰ مئی)

اصلاحی صاحب اسی سلسلہ میں اپنے جواب میں فرماتے ہیں۔

> ہم ان لوگوں کے نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے جو قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس ملک میں اقتدار کبھی قوم کی طرف منتقل ہی نہیں ہوا بلکہ اس کو بالا بالا کچھ غاصبین اچک لیتے رہے ہیں۔ اور اب بھی اسی طرح کے غاصبین ہی ہیں جو اس اقتدار کو غصب کئے ہوئے ہیں۔ یہ تاثر رکھنے والوں اور یہ تاثر دینے والوں کے نزدیک غالباً قوم سے مراد ان کی اپنی ذات اور ان کے اپنے گنتی کے چند اتباع ہوں گے مثل مشہور ہے کہ ہم ہوں گے تو جگ ہوگا۔ (المنبر۔ ۳ جون)

"انہیں علماء" کے نزدیک حصول پاکستان کا کریڈٹ قائداعظم اور ان کے رفقاء کو نہیں بلکہ مسلم عوام کو ملنا چاہیئے۔ چنانچہ دوسرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا ہے۔

> یہ آزادی جو اگست ۱۹۴۷ء میں ہم کو ملی تھی، دراصل کروڑوں مسلمانوں کی جدوجہد، محنت اور قربانی کا نتیجہ تھی...... اس نتیجے کے حصول میں سرکاری ملازمین اور سیاسی لیڈروں کا حصہ خواہ کتنے ہی مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جائے۔ بہرحال ان کروڑوں مسلمانوں کی جانفشانی کے مقابلہ میں وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر حقیقت کے اعتبار سے بھی برطانوی پارلیمنٹ دراصل باشندگان پاکستان کے حق ہی میں حاکمیت سے دستبردار ہوئی تھی نہ کہ چند سیاسی لیڈروں یا ملازمین ریاست کے حق میں۔ (تسنیم ۔ ۱۰ مئی)

اب مولانا اصلاحی صاحب کا جواب سنئے۔

> مسلم لیگ اور قائد اعظم کو جو اثر و اقتدار قوم میں حاصل تھا اس کی بنا پر وہی جائز حقدار تھے کہ انگریزوں سے اس قوم کی طرف سے اختیارات وصول کریں اور جب انہوں نے وصول کیا تو درحقیقت پاکستان میں بسنے والی قوم نے وصول کیا۔ (المنبر۔ ۳ جون)

"ان علماء کے نزدیک غلام محمد مرحوم اور صدر محمد ایوب کی طرف سے پاکستان کو انتشار اور عدم استحکام سے بچانے کے اقدامات "جھٹکے" ہیں جن کے اعادہ سے ملک کو بچانے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہ ہے۔

> ان (اختیارات کی) امانت کو جب تک ٹھیک ٹھیک جان اور مان نہ لیا جائے اور ایمانداری سے اسے ادا کرنے کا مخلصانہ ارادہ پیدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک آئندہ کے لئے پاکستان کے دستور کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل ممکن نہیں ہے جو اکتوبر سنہ ۵۴ء اور اکتوبر سنہ ۵۸ء کے جھٹکوں کا بار بار اعادہ ہونے سے اس ملک کو بچا سکے۔ (تسنیم۔ ۱۰ مئی)

اصلاحی صاحب اسی سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> ہمارے نزدیک فوج نے یہ اقدام محض ملک کو انتشار اور بدنظمی سے بچانے کے لئے کیا۔ اس کے اندر نہ تو قوم کے ہاتھوں سے اقتدار کو غصب کرنے کی کسی خواہش کا دخل تھا اور نہ سر دست کے لوگوں کے ساتھ اس مقصد کے لئے کوئی سازش یا جتھہ بندی کی گئی تھی۔ جو لوگ اس قسم کا گمان رکھتے ہیں ہمارے نزدیک ان کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے۔۔۔۔ ہمارے نزدیک فوج نے خطرہ کے آخری وقت میں ملک کو بچانے کا وہ فرض سرانجام دیا جو اس پر عائد ہوتا تھا۔ اگر اس وقت فوج یہ اقدام نہ کرتی تو وہ ایک ایسی کوتاہی کی مرتکب ہوتی جس کی تلافی شاید پھر کبھی نہ ہو سکتی۔
>
> (المنبر۔ ۳ جون)

یہ ہے ذہنی انتشار، اصولی اختلافات اور فکری تضادات کی وہ مختصر سی روئداد جو آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں ان حضرات کرام کی طرف سے ابھی ابھی منظر عام پر آئی ہے۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی آئین کے بنیادی اصولوں کے متعلق ان میں قطعاً کوئی اختلاف موجود نہیں۔ ان حضرات کے جوابات نے خود بخود خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کے اس نقاب کو الٹ دیا ہے۔

ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کی بنا پر ان حضرات سے صرف یہ پوچھنا مقصود ہے کہ فرمائیے اس کے بعد آپ کے اتحاد و اتفاق کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔ قرآن نے اسی خود فریبی کی ذہنیت کے متعلق ہی فرمایا تھا اور کس قدر درست فرمایا تھا کہ

تحسبهم جميعا وقلوبهم شتّٰى

(تم بظاہر سمجھو گے کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں)

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ "ترجمان اسلام" لاہور کا ۷ ارجون کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ سہ روزہ مولانا احمد علی صاحب کی سرپرستی اور مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اور مرکزی نظام العلماء کا ترجمان خصوصی ہے۔ اس اخبار نے صفحہ اول پر جلی عنوان سے جو کچھ انیس علماء اور ان کے جواب کے متعلق شائع کیا ہے ہم اسے بجنسہٖ بلا تبصرہ درج ذیل کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے قارئین کے سامنے مذکورہ تصویر کا ایک نیا رخ آنے لگا۔

علمائے کرام کا فرض ——— مودودیوں سے بچنا

جیسا کہ ہم نے پہلے خطرہ ظاہر کیا تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ سوالنامے کے جوابات سے جو انیس علماء کے نام سے شائع کرکے مودودی ایڈ کو دہلی سے آنے والے پانچ سواروں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان میں پادریوں کو عیسویت کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو مرتد ہونے کی اجازت سوال ۲۲ کے ضمن میں دے کر وہ خاص قسم کا فریضہ ادا کر رہا ہے اور عیار اور ناواقف چند علماء کے دستخطوں سے وہ اپنا کام لے رہا ہے۔ ورنہ اسلامی آئین میں محکمہ قضا میں غیر مسلم قاضیوں کے تقرر اور ارتداد کی اجازت کا کیا معنی ـــ؟

اب مودودی بیچارہ انیس علماء کے نام سے دستخط کرانا چاہتے ہیں مگر آگے سے زندہ علماء دین اور حساس مسلمان ان کو بے رنگ واپس کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سمندری ضلع لائلپور میں ایسا ہی ہوا۔ مقامی علماء نے یہ کہہ کر ان کو مجلس سے واپس دیدیا۔ اس وقت تمام علمائے دین ـــ طلباء کا فرض ہے کہ وہ لاہور کے دفتر ترجمان اسلام بیرون دہلی دروازہ سے تائیدی اشتہارات منگا کران پر دستخط کرا کر صدر ائمہ کمیٹی کے پاس بھیج دیں۔ اور عوام کو چالیس علمائے کرام اور نظام العلماء کی عاملہ کے جوابات ذہن نشین کرائیں۔ جو بھی اس کی تائید کریں وہ حکومت تک پہنچائیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ مگر جب ہم سے دریافت کیا گیا تو ہم کو چاہیئے کہ صرف اسلام کی روشنی میں مذہبی تعلیمات کے مطابق اپنا فرض ادا کریں۔

غلام غوث۔ ناظم اعلیٰ نظام العلماء مغربی پاکستان

اسی اخبار میں "مولانا محمد اسحاق صاحب مفتی ہزارہ ڈسٹرکٹ خطیب ایبٹ آباد" کی طرف سے جلی عنوان اور چوکھٹے میں ایک استفسار بھی شائع ہوا ہے جس میں مفتی محمد حسن اور مولانا ابوالحسنات

صاحبان[1] سے سوال کیا گیا ہے کہ

کیا آپ نے سابق دستور کی وہ دفعات پڑھی تھیں یا مولانا داؤد غزنوی اور مودودی کی باتوں میں آکر دستخط کر دیئے۔

آخر میں لکھا ہے۔

آپ کے دستخطوں سے خطرناک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ کی گئی تو آئندہ ارتداد اور کفر کی تبلیغ اور غیر مسلموں کی عدالتوں کی ذمہ داری کسی حکومت پر نہ ہوگی۔ اس کے جوابدہ عنداللہ آپ ہوں گے۔ لہٰذا جلد از جلد عوام کی اس غلط فہمی کو رفع کریں۔ آپ سے یہی توقع ہے کہ آپ جان بوجھ کر ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ آپ ہر دو حضرات آخری عمر میں اور سخت بیمار ہیں۔ لیکن آئین سازی کے وقت ایسی غلطی ناقابل برداشت ہے۔

یہ ہیں آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں وہ افکار و آراء جو حضرات علمائے کرام کی طرف سے اس وقت تک منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ (اس کے بعد دیگر علماء کی طرف سے جو کچھ شائع ہوگا اس کا اندازہ انہی اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے)۔ ہم نے یہ اقتباسات صرف اتنا بتانے کے لئے درج نہیں کئے کہ ان حضرات میں باہمی اختلافات کس قدر ہیں۔ ان کے اختلافات سے کون واقف نہیں۔ ہم جس خطرے کو محسوس کر رہے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ شدید، گمراہ اور تباہ کن ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ ملک میں ایسا طبقہ موجود ہے جو دینی نظام کی جگہ سیکولر نظامِ حکومت رائج کرنا چاہتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ یہ لوگ علماء حضرات کے ان اختلافات[2] کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے آڑ بنائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہاں سیکولر نظام نافذ کر دیا جائے۔ ہم علماء حضرات کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ وہ خدا کیلئے اس خطرہ کی شدت کو محسوس کریں اور اپنی ضد سے معاملہ کو اس حد تک نہ کھینچ کر لے جائیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود جو آپ حضرات میں ہیں کم از کم ایک قدرِ مشترک تو ایسی ہے جس پر آپ تمام حضرات کا اتفاق ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب۔۔۔ قرآن عظیم۔۔۔ آپ اس قدرِ مشترک کو سنگِ بنیاد قرار دیجئے اور مطالبہ پیش کیجئے کہ

کشود کی راہ

مملکت کا آئین قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کے مطابق مرتب کیا جائے اور کوئی ایسا قانون نافذ کیا جائے جو قرآن کریم کے خلاف ہو

اس میں سب کچھ آجائے گا۔ آپ ایسا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح یہاں کی زمین بدل جاتی ہے۔ آسمان بدل جاتا ہے اور سرزمین پاکستان پر پھر خدا کا تختِ اجلال اسی شان و شوکت سے بچھ جاتا ہے جسے چشم فلک نے ایک بار حجاز کی مقدس سرزمین پر بچھا دیکھا تھا جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔

---

[1] ان ہر دو حضرات نے مولانا مودودی صاحب وغیرہم کی معیت میں اکیس علماء کے مرتبہ جواب پر دستخط کر دیئے ہیں۔

[2] اس ضمن میں وہ اختلافات بھی ملاحظہ کیجئے جو "سنت" کی تفسیر و تعریف کے متعلق ان میں موجود ہیں اور جن کا ذکر اسی اشاعت میں شائع ہونے والے مقالہ میں کیا گیا ہے۔

قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں

انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کا نکھرا ہوا حل!

سلیم کے نام خطوط

(جلد اوّل اور جلد دوم)

(تیسری جلد عنقریب شائع ہو رہی ہے)

یہ حقیقت کشا خطوط قلبِ سلیم میں ابھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جواب پیش کرتے ہیں اور نوجوانانِ ملت کے قلب و نظر کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی جاں نواز تحریک ہیں۔

مفسرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا مخصوص دلکش، شگفتہ اور آسان فہم اندازِ نگارش۔ ہر دو جلدیں خوبصورت ٹائپ کی چھپی ہیں۔ عمدہ نفیس کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین سہ رنگا گردپوش۔ قیمت جلد اول آٹھ روپے۔ جلد دوم، چھ روپے

مکتبہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

کراچی کے دوستو!

آئندہ ہر اتوار کی صبح ۹ بجے، سندھ اسمبلی ہال (متصل سعید منزل) بندر روڈ میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی، سیاسی اور معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ قرآن کی بات، مفکرِ قرآن کی زبان سے۔

(بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے زیر اہتمام)

معیارِ انتخاب

۱۔ محمد الرسول صلعم

محترم رشید اختر ندوی نے تاریخ اسلام پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اُسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو اپنے طور پر ایک مستقل تصنیف اور ایک مکمل کتاب ہے۔

قیمت :- بیس روپے

۲۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

یہ اُس اموی شہزادے کی داستان ہے جس نے اول اوّل اپنا زمانہ عیش و عشرت میں گذارا۔ لیکن جب مسند خلافت پر متمکن ہوا تو اس کے دور کے زاہدان پارسا نے قسم کھا کر کہا کہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے سوا ان میں ایسا فرض شناس۔ عادل، نیک اور پارسا کوئی دوسرا مسلمان حکمران نہ تھا۔

قیمت۔ چار روپے۔

۳۔ خالد بن ولیدؓ

بہادر شہسوار۔ زبردست اور نڈر۔ جنگجو اور دلیر انسان جسے کفر کو مٹانے والی تلوار کا خطاب ملا۔ جسے رسول اللہ نے سیف اللہ کا لقب دیا۔ جس نے نوک شمشیر سے جابر بادشاہوں کے سینے زخمی کئے۔ یہ مسلمانوں کی محبوب تاریخ ہے

قیمت۔ چار روپے

۴۔ اسلامی تعلیمات

اس کتاب میں اسلام کے تمام محاسن کی تفصیل درج ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو مذہبی امور میں جن معلومات کی ضرورت ہے وہ سلسلہ وار بیان کر دی جائیں تاکہ اسکے مطالعہ کے بعد وہ اسلام کی روح سے واقف ہو جائے۔ قیمت۔ پانچ روپے

۵۔ ذکریٰ

قرآن مجید کے تیسویں پارے کی تمام سورتوں کا نہایت آسان زبان میں ترجمہ اور بے حد عام فہم انداز میں تفسیر۔ بڑی تقطیع۔ قیمت۔ چار روپے

۶۔ انتخاب مکاتیبؒ

سرسیدؒ۔ شبلیؒ۔ اقبالؒ۔ مرتبہ پروفیسر شیخ عطاء اللہ ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج چنیوٹ۔ پروفیسر صاحب نے اپنی اس تصنیف میں ان تین نامور بزرگ ہستیوں کے خطوط کا انتخاب پیش کیا ہے نفسیات کے ماہرین کا فیصلہ ہے کہ خط انسانی سیرت کا صحیح عکس ہوتا ہے۔ قیمت۔ چار روپے

ملنے کا پتہ۔ **مکتبہ طلوع اسلام**۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ **لاہور**

باسمہ تعالیٰ

بہ سلسلۂ آئین سازی

کتاب و سُنّت

کی صحیح پوزیشن

اور علمائے کرام کے باہمی اختلافات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

کتاب وسنّت

آئین کمیشن کے سوالنامے کے جوابات طلوعِ اسلام کی طرف سے مرتب اور شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ مجوزہ آئینِ پاکستان کی پہلی اساسی اور اصولی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔

طلوعِ اسلام کا مطالبہ

طلوعِ اسلام کا یہ مطالبہ نیا نہیں۔ اس نے تحریکِ پاکستان کی تائید اسی وجہ سے کی تھی کہ اس کے نزدیک مملکتِ پاکستان کی عمارت قرآن کریم کی غیر متبدل بنیادوں پر استوار ہونی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام آئین سازی کے سلسلہ میں اپنے اس مطالبہ کو مسلسل اور متواتر دہراتا رہا۔ اب جبکہ آئین سازی کا مسئلہ دوبارہ زیرِ غور ہے اس نے اس مطالبہ کو پھر پیش کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس مطالبہ کے حق میں فضا اس قدر سازگار ہو گئی ہے کہ اس سے پہلے مغرب کی مادہ پرستی سے متاثر اور روس کی کمیونزم کے دلدادہ گروہوں کی طرف سے اس کی جو مخالفت ہوا کرتی تھی، اب اس کی آواز کہیں سے سنائی نہیں دی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

لیکن ایک گروہ ایسا ہے جو اس مطالبہ کی مخالفت میں اب بھی ویسا ہی سرگرم ہے جیسا پہلے تھا۔ یہ گروہ ہمارے علمائے کرام کا ہے۔ انہوں نے سابقہ آئین سازی کے زمانے میں بھی اس مطالبہ کی مخالفت

قرآن کی مخالفت

کی تھی اور اب پھر اس کی مخالفت شروع کر دی ہے چنانچہ اگلے دنوں لاہور میں مختلف فرقوں کے نمائندگان کا اجتماع ہوا جس میں آئین کمیشن کے سوالنامے کے جوابات متفق طور پر مرتب کئے گئے۔ ان جوابات میں کہا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۶ء کے (منسوخ شدہ) دستور کو بحال کیا جائے کیونکہ وہ صحیح اسلامی دستور تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس دستور میں یہ دفعات رکھی گئی تھیں کہ

(۱) مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور

(۲) جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کا تعلق ہے "کتاب و سنت" کی تعبیر مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں کے عقائد کے مطابق کی جائے گی۔

بالفاظ دیگر ان علمائے کرام کی طرف سے جس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا ہے اور جس کی بنا پر یہ حضرات خیال کرتے ہیں کہ آئین صحیح اسلامی کہلا سکتا ہے، یہ ہے کہ

(۱) مملکت میں کتاب کے ساتھ سنت کو بھی برابر کی بنیادی حیثیت دی جائے اور کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے جو سنت کے خلاف ہو۔

(ہم نے "برابر کی حیثیت" اس لئے لکھ دیا ہے کہ ان حضرات نے "کتاب و سنت" کا ذکر کرتے وقت بظاہر ان میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ورنہ جیسا کہ آگے چل کر سامنے آئے گا۔ ان کے مطالبہ کی رُو سے کتاب اللہ کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ سنت قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے)

(۲) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آئینی سند عطا ہو جائے۔ اور

(۳) قانون کے دو حصے کئے جائیں شخصی اور ملکی۔

کتاب و سنّت

طلوع اسلام میں ان مسائل کے متعلق اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن چونکہ انھیں (اور بالخصوص "مقام سنت" کے سوال کو) آئین کے سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مقام پر ایک بار پھر تفصیل سے بات کی جائے کہ کتاب کے ساتھ سنت کے اضافہ کا عملی نتیجہ کیا ہے اور ہم نے اسے کیوں حذف کیا ہے۔

سنت سے مفہوم سنت رسول اللہ (صلعم) ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ موضوع کس قدر نازک ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی نسبت حضورؐ اقدس و اعظم کی ذات گرامی کی طرف ہو جائے اس کا تعلق ہمارے گہرے جذبات سے ہو جاتا ہے اور جن امور کا تعلق جذبات سے ہو ان کے متعلق گفتگو بڑی نزاکت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ موضوع تو پھر بھی رسول اکرمؐ کی سنت سے متعلق ہے۔

موضوع کی نزاکت

اس باب میں ہمارے جذبات کی نزاکت کا تو یہ عالم ہے کہ اگر کسی پتھر کے ٹکڑے سے متعلق مشہور ہو جائے کہ اس پر حضورؐ کا نعلِ پا مرتسم ہے تو اس نسبت سے اس پتھر کی عظمت و احترام کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارہ نہیں کرتا۔ ان حالات کے ماتحت ذرا سوچئے کہ اگر کسی کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ آئینِ پاکستان میں سنت رسول اللہؐ کو شامل نہیں ہونے دینا چاہتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمیں افسوس (اور انتہائی صدمہ) ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے علم و حقائق کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے، ہمیشہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اور کبھی اتنا سمجھنے

کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ طلوعِ اسلام اس باب میں کیا کہتا ہے؟ ہم ان حضرات کی خدمت میں بالعموم اور ملک کے دوسرے باہوش طبقہ سے بالخصوص عرض کریں گے کہ جو کچھ آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے خدا کے لئے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ اس سوال کا آئینِ پاکستان سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ یہ سوال کس قدر عمیق فکر و تدبر کا محتاج ہے اور اگر اس کے متعلق ٹھنڈے دل سے نہ سوچا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں ایک گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ سوال سامنے لایا جاتا رہا ہے کہ جس ملک میں اس قدر مذہبی فرقے موجود ہوں اور ان فرقوں میں اس قدر باہمی اختلافات ہوں وہاں ایک متفق علیہ اسلامی آئین کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے علمائے کرام کی طرف سے اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ کراچی میں مختلف فرقوں کے اکتیس علماء نے متفقہ طور پر آئین کا مسودہ پیش کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اتفاق اور اتحاد کا ثبوت اور کیا دیا جا سکتا ہے؟ اسی اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ اب لاہور کے اکتیس علماء کی طرف سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا بظاہر یہ بات بڑی معقول نظر

علماء کا متفقہ مطالبہ

آتی ہے کہ جب مختلف فرقوں کے نمائندے متفقہ طور پر ایک مطالبہ پیش کرتے ہیں تو پھر ان کے باہمی اختلافات کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ لیکن ذرا دیکھئے کہ وہ متفقہ مطالبہ کیا ہے؟ وہ مطالبہ یہ ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد "کتاب و سنت" پر رکھ دی جائے۔ اور ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اس متفق علیہ مطالبہ کی حقیقت کیا ہے؟

قرآن کریم

جب ہم "قرآن" کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہر مسلمان فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے مراد ایک کتاب ہے جس میں الحمد سے والناس تک جو کچھ لکھا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے نازل کیا تھا اور وہ لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً ہم تک محفوظ شکل میں پہنچا ہے۔ اس کے ذرہ برابر بھی کسی کو اختلاف نہیں[1]۔ لہٰذا جب ہم کہیں کہ پاکستان میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہیں ہوگی تو اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ قرآن سے مفہوم کیا ہے۔ نہ ہی اس باب میں کبھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ فلاں آیت جسے آیتِ قرآنی کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ بہت تو ایک طرف اگر کوئی شخص اس میں ایک لفظ کا رد و بدل کرے تو سینکڑوں آوازیں بیک وقت پکار اٹھیں گی کہ وہ قرآن کا لفظ نہیں ہے۔

سنت کسے کہتے ہیں؟

سوال یہ ہے کہ کیا سنت کی بھی یہی کیفیت ہے؟ جب ہم "سنت" کا لفظ بولتے ہیں تو کیا اس سے ہر مسلمان کا ذہن کسی خاص کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے متعلق

---

[1] یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیات کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ سر دست بحث قرآن کریم کے متن تک محدود ہے۔

اس کا ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ "سنت" ہے؟ اور کیا اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح متفق علیہ اور تنقید کی حد سے بلند ہے؟ اس سوال کا جواب پہلے آپ خود اپنے دل سے مانگیے اور دیکھیے کہ کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسی کتاب آتی ہے جسے آپ سنتِ رسول اللہ کا اسی طرح مستند مجموعہ سمجھتے ہوں جس طرح قرآن کریم کو وحیِ خداوندی کا مجموعہ سمجھتے ہیں؟ اس کے بعد آپ ان اکیس علماء کرام سے دریافت کیجئے کہ کیا وہ کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو تمام علماء امت کے نزدیک تو ایک طرف، ان اکیس علماء کے نزدیک قرآن کریم کی طرح متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو؟ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ یہ حضرات اس بات پر بھی آپس میں متفق نہیں کہ سنت کسے کہتے ہیں! آپ کو یہ دعوے کچھ تعجب انگیز سا دکھائی دے گا لیکن یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ خود اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ آپ خط لکھ کر ان سے دریافت کریں اور پھر دیکھیں کہ ان کی طرف سے اس استفسار کا جواب کیا موصول ہوتا ہے؟

اس اجتماع میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نمائندے شامل تھے۔ ہم چاہتے تو شرح و بسط سے بتا سکتے تھے کہ سنت کے مسئلہ میں ان فرقوں کے بانیوں کے یا ان کے دیگر اکابر سلف کے باہمی اختلافات کس قدر شدید تھے۔ لیکن یہ انداز اختیار کرنے کے بجائے ہم نے اسے زیادہ مناسب سمجھا ہے کہ بتایا جائے کہ جو حضرات اس اجتماع میں شریک تھے اور جن کی طرف سے یہ متفقہ مطالبہ پیش کیا گیا ہے، سنت کے بارے میں خود ان میں کس قدر سخت اختلافات ہیں۔ ان میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب تھے جو جمعیت اہلِ حدیث گوجرانوالہ کے خطیب ہیں (ان کے ساتھ مولانا محمد داؤد غزنوی۔ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب، مدیر الاعتصام تھے جو اسی مکتبِ فکر سے متعلق ہیں) دوسری طرف مولانا محمد شفیع صاحب (دیوبندی) مولانا ابوالحسنات قادری صاحب، امیر جمعیت العلماء پاکستان (اور ان کے دیگر ہم خیال حضرات) حنفی مکتبِ فکر کے نمائندے تھے (اگرچہ ان میں بھی دیوبندی اور بریلوی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں)۔ ندوۃ کے نمائندہ مولانا محمد حنیف صاحب تھے۔ (سابق) جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنت کے متعلق ان حضرات کے باہمی اختلافات کس قدر ہیں۔ واضح رہے کہ ان کے یہ اختلافات سنت کی تعبیر کے اختلافات نہیں۔ اختلاف اس امر میں ہے کہ (i) سنت کہتے کسے ہیں اور (ii) فلاں حدیث جو پیش کی جا رہی ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔

باہمی اختلاف چند ہی سال ادھر کا ذکر ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب (اور ان کے ہم نواؤں) کے مسلکِ حدیث پر سخت تنقید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ حضرات "سنت" سے جو مفہوم لیتے ہیں اس سے ان کے مسلک کے ڈانڈے منکرینِ حدیث سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رسالہ میں منکرینِ حدیث کی جو فہرست شائع کی تھی اس میں سر سید۔ مولانا شبلی۔ مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ مودودی صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور عام فرزندانِ ندوہ کو بھی شامل کیا تھا۔ اگرچہ ان کے متعلق لکھا تھا کہ

یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے انداز فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے۔ اور طریق گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ (ص ۴۴)

مولانا اسمٰعیل صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ سنت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سنت کہا جاتا ہے۔ ان کی اس تعریف کی رُو سے "کتاب و سنت" کے معنی ہوں گے "قرآن و حدیث" لیکن مودودی صاحب کے نزدیک سنت کا مفہوم اس سے الگ ہے۔ وہ اپنی کتاب "رسائل و مسائل" میں لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کے نزدیک

سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے۔ یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے۔[1] یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز سنت ہے اور کونسا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصول کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی بناء پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا (ص ۳۱۷ تا ۳۱۸)

---

[1] ممکن ہے اس مقام پر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مودودی صاحب سے یہ پوچھیں کہ اس سے پہلے آپ یہ لکھ چکے ہیں کہ

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپؐ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے۔ مربی اور مزکی بھی تھے قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت ہو گئے تھے۔ (تفہیمات حصہ اول۔ ص ۲۲۱)

اور اب آپ حضورؐ کی شخصی زندگی اور رسالت کی زندگی کو الگ الگ قرار دے رہے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ کیا ہے! مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے تضادات عام ملیں گے۔

اسی کتاب میں وہ صفحہ [illegible] پر لکھتے ہیں۔

> بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرز خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دین میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی مولانا اسماعیل صاحب کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنتِ رسول اللہ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

> میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً صفحہ [illegible])

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں۔

> جو امور آپؐ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (صفحہ [illegible])

اس کا نتیجہ

ان تصریحات کی روشنی میں ایک عملی شکل کو سامنے لائیے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جاتی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو کتاب و "سنت" کے خلاف ہو۔ ایک قانون ملک میں نافذ ہو جاتا ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب چیلنج کرتے ہیں کہ وہ "سنت" کے خلاف ہے اس لئے وہ قانون ناجائز ہے۔ اس کی تائید میں وہ ایک حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مودودی صاحب تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قانون سنت کے خلاف نہیں۔ مولانا اسماعیل صاحب دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟

مودودی صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیث تو صحیح ہے لیکن رسول اللہ نے وہ عمل اپنی بشری حیثیت سے عادۃً فرمایا تھا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ مولانا اسماعیل صاحب پوچھتے ہیں کہ اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے وہ کام عادتاً کیا تھا۔ مودودی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے۔

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور مارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے...... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے...... اس مقام پر پہونچ جانے کے بعد اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس فادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۳ تا صفحہ ۳۲۴)

مولانا اسمٰعیل صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کرے۔ پھر اسے اختیار دیدے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق۔ مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔
>
> (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ ۶۳)

یعنی جس چیز کو مودودی صاحب سنتِ رسول اللہ قرار دیتے ہیں اسے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنت کے خلاف ہوائی حملے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سنت کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود دونوں کا دعویٰ ہے کہ ہمارا مطالبہ متفق علیہ ہے۔

اصلاحی صاحب

یہاں تک بات صرف مودودی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے درمیان تھی۔ اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

> حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلعم کی نسبت سے ساتھ کی جائے۔ لیکن سنت سے مراد نبی صلعم کا صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپ نے بار بار عمل کیا ہو۔ جس کی آپ نے محافظت فرمائی ہو۔ جس کے متعلق عام طور پر پابند رہے ہوں۔
>
> (ایضاً صـ۲۵)

اس کے متعلق مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں۔

> مولانا (اصلاحی) نے سنت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق صرف چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرتؐ سے علی سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان..... ہزار دفعہ فرمایا جائے کہ "اگر کوئی شخص اس سنت کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا" سوال یہ ہے کہ اس سنت کی چھانٹی ہے کہاں تک ـــــ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ سے ہی ثابت کرنا ہوگا۔ پھر اس ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (ایضاً صـ۲۶)

یہ ہے "سنت" کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق ان حضرات کا وہ اختلاف جس کی بنا پر مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ

> میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزالی و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (ایضاً صـ۱۱۰)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب وسنت" کا متفقہ مطالبہ کرنے والوں میں اس امر پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنت کہتے کسے ہیں؟" جو چیز ایک کے نزدیک "سنت" ہے وہ دوسرے کے نزدیک "بدعت اور دین میں تحریف" ہے۔

حدیث

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ صحیح احادیث کی موجودگی میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یہ حضرات "سنت" کا کوئی متفق علیہ مجموعہ پیش کر سکیں۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کے پاس احادیث کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ قطعاً نہیں۔ احادیث کے بے شمار مجموعے ہیں۔ مولانا سندھی (مرحوم) کے الفاظ میں ـــــ

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی سنہ ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں۔ تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔

(مقام حدیث جلد اول ص۲۴۹)

یعنی (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق کے مطابق) احادیث کے قریب پچاس مجموعے ہیں اور سب میں غلط اور صحیح احادیث ملی جلی ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو "صحاح ستہ" (یعنی صحیح کتابیں) کہا جاتا ہے۔ ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ چھ کون کون سی ہیں لیکن ان میں سے بخاری اور مسلم کو سب سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں میں بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔

• حدیث کے متعلق مولانا اسماعیل صاحب فرماتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کی ایک حیثیت ہے

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ...... جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں۔ ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔

(ایضاً ص[illegible])

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے ...... ان احادیث کی صحت قطعی ہے (ایضاً ص۵۵)

بالفاظ دیگر مولانا اسمٰعیل صاحب کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ہے ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

جبریل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرت کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (ایضاً ص[illegible])

یعنی قرآن اور حدیث دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی حضورؐ کو ملے تھے اور دونوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں۔ اب دیکھئے اس باب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں۔

مودودی صاحب کا مسلک

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا

تمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے بستے تھے بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن بابت ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء)

اس سے مودودی صاحب نے واضح کر دیا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا یہ ارشاد کہ احادیث بھی قرآن کی طرح منزل من اللہ وحی ہیں صحیح نہیں۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اور احادیث نبی اکرمؐ کا اپنا کلام۔ اور دونوں کا فرق بالکل بدیہی اور واضح ہے۔

دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

ان امور کے متعلق (یعنی دجال کے متعلق) جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپؐ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپؐ خود شک میں رہتے تھے ..... یہ باتیں آپؐ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپؐ کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح ثابت ہونے سے آپؐ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہوں۔ (رسائل و مسائل صفحہ ۵۶-۵۵)

اس کے بعد وہ رسائل و مسائل صفحہ ۶۷ پر لکھتے ہیں۔

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقینی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو۔ انہیں محض چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی مقتضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔

مودودی صاحب نے یہ خیالات "ظہور مہدی" سے متعلق احادیث کے سلسلہ میں ظاہر فرمائے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ صرف ظہور مہدی سے متعلق احادیث کو ایسا سمجھتے ہیں۔ تمام احادیث کے متعلق ان کے یہی خیالات ہیں چنانچہ وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

نبی علیہ السلام کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپؐ نے ارشاد فرمایا ہو وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو۔ لیکن قول رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل صفحہ ۲۸۔)

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(ایضاً صفحہ ۲۹۔)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک احادیث کے پرکھنے کی کسوٹی "مزاج شناسیٔ رسولؐ" کی نگہ بصیرت ہے جس حدیث کو وہ صحیح کہدے، وہ صحیح ہو گی۔ جسے وہ غلط قرار دیدے وہ غلط قرار پا جائے گی۔ لیکن اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں کہ کسی کی "نگہ بصیرت" دوسرے کے لئے سند نہیں قرار پا سکتی۔ وہ فرماتے ہیں۔

اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۳۱۔)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) جو عقیدہ نبی اکرمؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم حضورؐ نے دیا ہو اس پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن میں بیان کردہ عقیدہ یا حکم پر ایمان لانا اور اس کی

اطاعت کرنا۔

(ii) جو کچھ بھی اکرمؐ نے فرمایا تھا وہ احادیث کی کتابوں میں منقول ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سب کچھ نبی اکرمؐ کا فرمودہ ہے۔ وہ صرف رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہے۔

(iii) اس کا فیصلہ کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو کچھ رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس میں فی الواقعہ رسول اللہؐ کا فرمودہ کیا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جنہیں حضورؐ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔

(iv) اس چیز کا فیصلہ "مزاج شناس رسولؐ" کی نگۂ بصیرت ہی کر سکتی ہے۔

(v) لیکن نگۂ بصیرت ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ایک شخص فرمودۂ رسولؐ قرار دے، اسے دوسرا شخص بھی بالضرور فرمودۂ رسولؐ تسلیم کر لے۔

مودودی صاحب منکر حدیث ہیں

مودودی صاحب کے ایسے خیالات کو پڑھ کر، مولانا ظفر احمد عثمانی صدر جمعیت علمائے اسلام پاکستان نے اپنے فتوے میں لکھا تھا کہ

یہ شخص منکر حدیث ہے، گمراہ اور مبتدع ہے۔ جاہل اجہل ہے۔ پاگل ہے۔ (مقام حدیث۔ جلد دوم صفحہ ۔۔۔)

قطع نظر اس سے کہ مودودی صاحب کے متعلق اہل حدیث اور حنفی علماء کے خیالات کیا ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ حدیث کے متعلق جو نظریہ انہوں نے بیان فرمایا ہے اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر دین انفرادی چیز ہو تو ہو سکتا ہے کہ جس بات کو ایک اپنی نگۂ بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسولؐ سمجھے وہ اس پر عمل کرے اور جسے کوئی اپنی بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسولؐ سمجھے

عملی نتیجہ

وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ دونوں کو ان کی حسن نیت کا ثواب مل جائے گا۔ لیکن جب آپ فرمودۂ رسولؐ کو مملکت کے آئین اور حکومت کے قوانین کی غیر متبدل اور ابدی بنیاد قرار دیدیں اور اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "فرمودۂ رسولؐ" کے خلاف ہو اور کسی بات کے "فرمودۂ رسولؐ" ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ افراد کے ذوق اور بصیرت کے مطابق ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس وقت پاکستان میں کوئی قانون کبھی بن سکے گا؟

مولانا اسمٰعیل صاحب نے فرمایا تھا کہ صحیحین۔ یعنی بخاری اور مسلم کی سب احادیث صحیح ہیں اور ان میں سے کسی کا

بخاری کی احادیث

انکار کفر ہے۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی چوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر دسمبر ۱۹۵۲ء)

یہ خیال تنہا مودودی صاحب ہی کا نہیں۔ پاکستان میں اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے۔ اسی مکتب فکر کے ایک جید عالم، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، صدر مدرس جامعہ اشرفیہ منڈو الہیار (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) اپنے ایک مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں

> حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری و مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں۔ اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے۔ مگر اس سے وہ مواضع مستثنیٰ ہیں جن پر دارقطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محل اختلاف ہیں۔ دارقطنی وغیرہ نے تقریباً دو سو احادیث پر تنقید کی ہے جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔
>
> (طلوع اسلام۔ اگست ۵۹ء۔ صفحہ ۴۳)

بخاری و مسلم کی احادیث کے متعلق یہ عقیدہ حنفی علماء کا ہے۔ بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے جماعت اہل حدیث کے سرخیل، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ترجمان القرآن۔ جلد دوم (صفحہ ۴۹۸-۴۹۹) میں لکھتے ہیں کہ

> روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ (بخاری کی روایت دربارہ کذب حضرت ابراہیمؑ) اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا ماننے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

یعنی مولانا آزاد (مرحوم) کے نزدیک بخاری اور مسلم میں بھی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں قول رسولؐ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

احادیث مرتب کیسے ہوئی تھیں؟

اس مقام پر مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ احادیث کے یہ مجموعے (مثلاً بخاری وغیرہ) مرتب کس طرح ہوئے تھے؟ یہ واقعہ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ

(۱) نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کرا کر امت کو نہیں دیا۔

(۲) نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اس قسم کا کوئی مجموعہ مرتب کیا (انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔

(۳) رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد امام محمد بن اسمٰعیلؒ نے (جو بخارا کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے سنہ ۲۵۶ھ میں وفات پائی) اپنے طور پر احادیث کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان کے سامنے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا۔ انہوں نے ان روایات کو جمع کیا جو زبان زد خلائق تھیں اور جنہیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مثلاً اس کا طریق یہ تھا کہ جس شخص نے امام بخاریؒ سے کوئی روایت بیان کی اس نے کہا کہ میں نے یہ بات فلاں

صاحب سے سنی تھی۔ انھوں نے فلاں سے سنی۔ انھوں نے فلاں سے۔ انھوں نے فلاں صحابیؓ سے جنھوں نے کہا کہ رسول اللہ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ اس طرح انھوں نے قریب چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انھوں نے ۷۲۷۵ احادیث کو اپنی شروط کے مطابق پایا۔ باقی کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی روایات کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ انھیں امام بخاری کی احادیث کہا جاتا ہے۔

اس طریق سے جمع کردہ روایات میں غلطیاں کس انداز سے ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق مودودی صاحب نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ روایت میں سب سے پہلے بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فلاں صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔ اس ضمن میں مودودی صاحب بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کی تنقید

> ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبیؐ کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہوں گے .... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو بعض روایات نے صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔
>
> (ترجمان۔ احادیث نمبر۔ مورخہ ۱۴ ...)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک سلسلۂ روایات کی پہلی کڑی میں ہی غلط فہمیوں کی گنجائش تھی۔ اب رہیں بعد کی کڑیاں۔ سو اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

> بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیے لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس پر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سر مو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا۔ مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھیے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے

کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا۔ کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح نہ ادا کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل در روایت میں غلطیاں کرے گا۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۹-۳۳۰)

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے۔ آپ خیال فرمایئے کہ اس انداز سے مرتب شدہ احادیث میں سے کسی حدیث کے متعلق کبھی بھی اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ من و عن رسول اللہ کا قول ہے؟ یہ بھی واضح ہے کہ احادیث کے متعلق یہ کسی کا بھی عقیدہ نہیں کہ وہ رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔ جو راویوں نے آگے منتقل کئے ہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کے الفاظ کا مفہوم ہیں۔ یعنی رسول اللہ نے کچھ فرمایا۔ سننے والے صحابیؓ نے حضورؐ کے الفاظ کا جو مفہوم سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے بیان کیا۔ اس نے اس صحابیؓ کے الفاظ سے جو مطلب سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے روایت کیا۔ اس طرح یہ مفہوم، مختلف راویوں کے الفاظ میں آگے منتقل ہوتا چلا گیا تا آنکہ آخری راوی کا بیان، حدیث کے مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔

فرض کر لیجئے کہ ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد کسی حدیث کے متعلق اس پر اتفاق ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح ہے

ہر صحیح حدیث بھی واجب العمل نہیں

سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد وہ حدیث سب کے نزدیک واجب العمل ہو جائے گی؟ آپ کہیں گے کہ اس میں اب کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اسے واجب العمل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن نہیں۔ اس کے بعد بھی ایک اور مرحلہ باقی ہے۔

جماعت اسلامی سے جو حضرات الگ ہوئے تھے۔ انکوں نے مودودی صاحب کے خلاف ایک الزام یہ بھی عاید کیا تھا کہ وہ جب تک نظری سیاست کی منزل میں رہے، دین کے مطابق اصولوں کی تبلیغ کرتے رہے لیکن جب عملی سیاست کا وقت آیا تو کچھ اور ہی روش اختیار کر لی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا کہ یہ بات کچھ میں نے انوکھی نہیں کی۔ (معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے بھی یہی کیا تھا۔ حضورؐ ساری عمر اخوت و مساوات کے اصولوں کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن جب عملاً تشکیل حکومت کا وقت آیا تو آپؐ نے فرما دیا "الائمۃ من قریش" خلافت قریش میں رہے گی۔ مودودی صاحب کے فریق مقابل (مولانا امین احسن و صاحب اصلاحی) "الائمۃ من قریش" والی حدیث کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ کا یہ حکم مستقل نہیں تھا۔ آپؐ نے ایک تفیہ کا وقتی فیصلہ دیا تھا۔ اور

> ایک مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں (بڑا باریک) فرق ہوتا ہے۔
>
> (میثاق۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

اس اصول کو خود مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ان سے جب (ضبط ولادت کے سلسلہ میں) عزل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ

> عزل کے متعلق جو کچھ آنحضورؐ سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضورؐ نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا...... عزل کی اجازت کیا جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوری بیان کی اور آنحضورؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔
>
> (ترجمان القرآن بابت اپریل سنہ ۱۹۶۰ء)

لہٰذا جس حدیث کو فریقین صحیح تسلیم کرلیں اس کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ حضورؐ کا وہ حکم مستقل تھا یا آپؐ نے ہنگامی استثنائی یا انفرادی قضیہ کا فیصلہ کرنے کے لئے ایسا ارشاد فرمایا تھا۔ آخر الذکر کی صورت میں اس حکم کی اطاعت لازم نہیں آئے گی۔ اب سوچئے کہ اس کا فیصلہ کس طرح سے ہوگا کہ حضورؐ کا فلاں حکم مستقل نوعیت کا تھا یا ہنگامی اور انفرادی حیثیت رکھتا تھا؟ چنانچہ، اصلاحی صاحب "الائمۃ من قریش" کے حکم کو ہنگامی قرار دیتے ہیں اور مودودی صاحب مستقل۔ اسی طرح مودودی صاحب عزل کی اجازت کو انفرادی قرار دیتے ہیں اور ان کے فریق مقابل اسے عام اجازت تصور کرتے ہیں۔

حدیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے

آپ کہیں گے کہ حدیث کو پرکھنے کا سیدھا اور صاف طریقہ یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کریم کے خلاف جائے اُسے غلط قرار دیا جائے۔ یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے لیکن ہمارے علمائے کرام کا عقیدہ اس باب میں کچھ اور ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کریم کے خلاف بھی ہوسکتی ہے اور جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو حدیث قرآن کو منسوخ کردیتی ہے۔ چنانچہ علامہ مولوی حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی اپنے کتابچہ 'فتنۂ انکارِ حدیث' میں لکھتے ہیں۔

> نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت ہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے...... جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ اسی طرح نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو (صلے م

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

> رہی یہ بات کہ قول رسول قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۰) "تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ موت آئے" رسول اللہ نے فرمایا لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اور قول رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص[illegible])

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں۔

> اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول کا قول قرآن کو منسوخ کر دے۔ تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسول کا قول اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قول رسول) دوسرے قول۔ یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص[illegible])

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک قرآن کی بہت سی آیات ہیں جنہیں یا تو قرآن کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیا ہے یا حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ اب ان آیات کی صرف تلاوت ہوتی ہے۔ ان پر عمل نہیں ہوتا۔

قرآن مکمل دین نہیں

ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم دین کا مکمل ضابطہ نہیں۔ حدیث کی پوزیشن مثلہ معہ ہے۔ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں۔

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر کیا ہے۔ اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔۔۔۔۔ مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جولائی، اگست، ستمبر [illegible])

اس مقام پر مودودی صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ جب دین کی تکمیل قرآن اور حدیث' دونوں کے مجموعے سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں' قرآن ہی میں کیوں نہ بیان کر دیا تاکہ امت کے پاس دین کا مکمل اور محفوظ ضابطہ موجود ہوتا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ

> اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۳۷)

یوں "دین کے ایک غیر متبدل' ابدی حصہ" کو قرآن سے باہر احادیث کے اندر رکھ دیا گیا اور احادیث کے مجموعوں سے اسے تلاش کرنے کا فریضہ "مزاج شناس" کی نگرِ بصیرت کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! حدیث کی پوزیشن ہمارے علمائے کرام کے اپنے الفاظ میں۔ ہم نے ہر اقتباس کے ساتھ حوالہ نقل کر دیا ہے تاکہ یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ہم نے کچھ اپنی طرف سے لکھ دیا ہے یا توڑ مروڑ کر پیش کر دیا ہے۔ آپ ان حوالوں سے اصل عبارات نکال کر دیکھ لیں اور سیاق و سباق سے ملا کر اپنا اطمینان کر لیں۔

اتنا اور واضح کر دیا جائے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ سُنی حضرات کا عقیدہ ہے۔ شیعہ حضرات سنیوں کی احادیث کے مجموعوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کی احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ایک مستفسر کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> آپ کو جو اس بات پر تعجب ہے کہ آخر دا صحیح احادیث کی موجودگی میں وہ (شیعہ حضرات) کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں تو آپ کو یہ تعجب غالباً اس غلط فہمی کے سبب سے ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی جن کتابوں کو آپ مستند و معتبر مانتے ہیں یہ حضرات بھی ان کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیجئے۔ ان حضرات کی حدیث و فقہ ہر چیز کے اپنے مجموعے ہیں جو ان کے اپنے خاص ذرائع سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ انہی کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ ان مجموعہ ہائے احادیث کو یہ کوئی وزن نہیں دیتے جو ہمارے ہاں معتبر ہیں۔
>
> (میثاق بابت مئی سنہ ۱۹۶۰ء)

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ دیکھئے! ہم نے متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد کتاب و سنت پر ہونی چاہیئے۔ اس لئے اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں اتنے فرقے موجود ہیں اور فرقوں میں اس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے ہم متفق علیہ اسلامی آئین کس طرح بنا سکتے ہیں۔ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ یہ حضرات یہ کہہ کر خوش ہو جاتے

ہیں کہ ہم نے اس مشکل مسئلہ کو یوں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ "سنت" کے معاملہ میں ان کے باہمی اختلافات بنیادی ہیں اور جس بات کو ایک فرقہ یا فرد سنت قرار دیتا ہے، دوسرا اسے سنت سمجھتا ہی نہیں۔ یعنی ان کا اس بنیاد پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں؟ اور وہ کس کتاب میں ہے؟ یہ حضرات اس وقت تو لیپا پوتی سے کام لے سکتے ہیں لیکن جب کل عملاً یہ سوال سامنے آیا کہ فلاں قانون مطابقِ سنت ہے یا نہیں؟ تو اس متفق علیہ مطالبہ کی قلعی کھل جائے گی۔ اس وقت ان میں سے ہر ایک کا فیصلہ الگ الگ ہوگا۔ ان حضرات کو اس حقیقت کا خود احساس ہے۔ اس کا انھوں نے حل یہ سوچا ہے کہ آئین میں یہ شق رکھ دی جائے کہ شخصی قانون (PERSONAL LAW)

شخصی قانون

میں قرآن و سنت کی تعبیر وہی لی جائے جو متعلقہ فرقے کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ (ہم اس سوال کو ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے کہ قرآن کی رُو سے شخصی اور ملکی قانون کی تفریق ہی غلط ہے۔ سرِدست یہ دیکھئے کہ) اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شخصی قانون کی صورت میں ہر فرقہ کی الگ الگ تعبیر قابلِ قبول ہوگی تو ملکی قانون کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا۔ اس لئے کہ کتاب و سنت کی مطابقت کی شرط ملکی قانون پر بھی اسی طرح عاید ہوگی جس طرح شخصی قانون پر۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں ملکی قانون مطابقِ سنت ہے یا نہیں جبکہ ملک کے سامنے سنت کی کوئی جامع تعریف یا کتاب ہی نہیں ہوگی۔ ان حضرات نے یہ مطالبہ پیش کر کے کہ شخصی قانون میں ہر فرقہ کی "کتاب و سنت کی الگ الگ تعبیر تسلیم کر لی جائے" اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ کتاب و سنت سے شخصی قوانین بھی ایسے نہیں بنائے جا سکتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوں۔ اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کتاب و سنت سے شخصی قوانین بھی متفق علیہ نہیں بن سکتے (یعنی کتاب و سنت کی رُو سے نکاح اور طلاق وغیرہ سے متعلق قوانین بھی ایسے نہیں بن سکتے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہوں) تو اسی کتاب و سنت کی رُو سے متفق علیہ ملکی قوانین کس طرح بن سکیں گے؟ حضرات علمائے کرام نے نہ اپنے سابقہ مطالبہ میں اس کی تصریح فرمائی تھی اور نہ اب ہی اس کے متعلق اشارہ تک کیا ہے؟

یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق یہ حضرات آئین جیسے اہم اور پیچیدہ مسئلہ کی اس بنیادی شق سے یوں آنکھیں بند کر کے گزر جانا چاہتے ہیں۔ اور جو شخص حقائق کا سامنا کرنے کے بعد ان سے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے اس کے متعلق شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی سے ایسے اہم مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ یہ آئین کا بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل آپ کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے۔ اگر آپ حضرات، طلوعِ اسلام کو گالیاں دینے کے بجائے، اس تمام عرصہ میں

کرنے کا کام

(۱) "سنتِ رسول اللہ" کی ایسی تعریف (DEFINITION) مرتب کر لیتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتی۔ اور

(۱) کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر دیتے جس میں پوری کی پوری سنت رسول اللہ درج ہوئی اور اس کتاب کا متن سب کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہوتا۔ پھر بھی آپ کہہ سکتے کہ ہم نے ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ مطالبہ پیش کرنے والے اس خشتِ اول ہی پر متفق نہ ہوں کہ سنت کہتے کسے ہیں اور وہ کہاں سے ملے گی تو ان کے مطالبہ کو متفق علیہ کہنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر آپ یقیناً سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے اور بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی آئین مرتب ہو ہی نہیں سکتا، وہ سچے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کا آئین جسے اسلامی کہہ دیا گیا تھا، ایک دن بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اور اگر اب پھر اسی قسم کا آئین بنا دیا گیا تو وہ بھی ایک دن نہیں چل سکیگا۔ لہٰذا کشود کی راہ یہی ہے کہ ان خار دار جھاڑیوں سے الگ رہتے ہوئے، جس طرح باقی دنیا اپنا اپنا آئین بناتی ہے ہم بھی ویسا ہی آئین بنا لیں۔

سیکولر آئین اسلامی آئین کا جو تصور ہمارے علمائے کرام پیش کرتے ہیں اس کے پیشِ نظر کوئی شخص مندرجہ بالا نتیجہ کے سوا کسی اور نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ علمائے کرام کا یہی انداز تھا جس سے تنگ آکر ترکی کو سیکولر آئین اختیار کرنا پڑا تھا۔ اور یہی وہ وقت ہے جس کا حل سامنے نہ ہونے سے پاکستان میں سیکولر آئین کی آوازیں کان میں پڑتی ہیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ صحیح اسلامی آئین، جو حقائق کی روشنی میں قابلِ عمل ہو، مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے

مسئلہ کا حل مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ آئین کے معاملہ میں اسلام کا منشاء کیا ہے۔ طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا اور رسول کا منشاء یہ تھا کہ اسلامی آئین کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر رکھی جائے جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کاروبار چلائے۔ علمائے کرام کا کہنا ہے کہ آئین کی بنیاد کتاب و سنت یا قرآن اور حدیث پر رکھی جائے اور دونوں کو غیر متبدل اور ابدی قرار دیا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ قرار پانا تھا تو

(۱) کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ جس طرح اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا تھا، احادیث کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا۔ اور

(۲) کیا نبی اکرم کا یہ فریضۂ رسالت نہیں تھا کہ آپ قرآن کے ساتھ اپنی احادیث کا مجموعہ بھی امت کو دے کر جاتے تاکہ یہ دونوں چیزیں امت کے پاس متفق علیہ طور پر ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتیں اور اس قسم کا کوئی اجتہاد پیدا نہ ہوتا جو حدیث کے بارے میں گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آیا ہے؟ جب رسول اللہ نے ایسا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تو اس سے انسان لامحالہ دو نتیجوں میں سے کسی ایک پر پہنچتا ہے۔ یعنی

منشائے نبویؐ

(۲) یا تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) حضورؐ سے سہواً یہ کام رہ گیا۔
(۳) اور یا حضورؐ نے دانستہ ایسا کیا

پہلے نتیجہ کا تو کوئی مسلمان تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے دوسری بات ہی باقی رہتی ہے کہ منشائے رسالت ہی یہ تھا کہ امت قرآن کریم کی راہ نمائی میں آگے چلے۔ چنانچہ واقعات خود اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً

(۱) مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحه مجھ سے نہ لکھو اور جس شخص نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ نے صرف قرآن کریم کی کتابت کرائی تھی۔ احادیث کو لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ خود یہ واقعہ کہ حضورؐ نے احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا اس کا بین ثبوت ہے کہ حضورؐ نے احادیث کی کتابت نہیں کرائی تھی۔

(۲) بخاری میں حضرت عبدالعزیز بن رفیع سے روایت ہے کہ میں اور شداد بن معقل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا "کیا آنحضرتؐ نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انھوں نے جواب دیا "آپ نے ما بین الدفتین (یعنی مجلد قرآن کریم) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔ عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن حنفیہؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ "آپ نے ما بین الدفتین کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا"

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے وقت قرآن کریم مدون (کتابی) شکل میں نہیں تھا۔ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جمع اور مرتب کیا گیا تو یہ خیال خود قرآن کریم اور واقعات کے خلاف ہے۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم اسی شکل میں جس میں وہ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، امت کو دیا تھا۔ اور قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز امت کو نہیں دی تھی۔

خلفائے راشدینؓ کا عمل

نبی اکرمؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور کے متعلق علامہ محمد الخضری مصری (مرحوم) اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی (اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین) میں لکھتے ہیں۔

(۳) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا تو رسول اللہ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے۔ اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ (صفحہ ۱۶)

اس کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس کے متعلق علامہ خضری لکھتے ہیں۔

(۲) سیوطی نے تنویر الحوالک شرح موطا امام مالکؒ میں ایک روایت میں جس کا سلسلہ حضرت عروہ بن زبیرؓ تک منتہی ہوتا ہے، یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے احادیث کو لکھوانا چاہا اور اس بارے میں اصحابِ رسول اللہؐ سے مشورہ کیا تو تمام صحابہؓ نے اس کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ ایک ماہ تک خود غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن انہوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ میں نے، جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ تم سے تحریرِ احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہلِ کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہو گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہیں کروں گا۔ اس لئے انہوں نے تحریرِ احادیث کا کام چھوڑ دیا۔ (صفحہ ۱۶۳)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ صورتِ حالات یہ نہیں کہ عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہؓ میں جمع و تدوینِ احادیث کا کام سہواً رہ گیا تھا۔ اور بعد میں امام بخاریؒ وغیرہ نے اسے پورا کر کے دین کے اہم ایک جزو کو محفوظ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اسے دین کا ابدی جزو قرار ہی نہیں دیا تھا اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اسے ایسا سمجھا تھا۔ یہ خیال بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر یہ دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ ہوتا تو عہدِ رسالت مآبؐ اور زمانۂ خلافتِ راشدہؓ میں اسے محفوظ کیوں نہ کر دیا جاتا؟ نبی اکرمؐ نے امت کو قرآن کریم ہی دیا تھا اور اسی پر اسلامی مملکت (خلافتِ راشدہؓ) نے اپنے "آئین" کی بنیاد رکھی۔ اس لئے کہ جیسا کہ مودودی صاحب نے بھی لکھا ہے۔

قرآن کی پوزیشن دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو بدایت سے بالاتفاق سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

(تفہیمات، جلد اول۔ صفحہ ۳۳۹)

وہ رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارتاً و کنایتاً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ۔ (صفحہ ۳۴)

وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (صفحہ ۵۰۵) میں لکھتے ہیں۔

حرام اور حلال۔۔۔۔۔ جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا۔ اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوند ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اس حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوم (صفحہ ۲۸۹) میں لکھتے ہیں۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابو داؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ماحرم اللہ فی کتابہ۔ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو وہ معاف ہیں۔

قرآن کریم کا انداز بیان ایسا صاف، سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں

قرآن کریم اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت اپریل۔ مئی سنہ ۱۹۵۲ء)

قرآن کے سمجھنے کے لئے کسی تفسیر کی بھی ضرورت نہیں۔

قرآن کے لئے کسی تفسیر کی بھی حاجت نہیں۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو (تنقیحات۔ صفحہ ۱۹۳)

قرآن کو خود قرآن سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی فرماتے ہیں۔

قرآن کے اندر اسرار حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے۔ لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے ارشادات و الفاظ ہیں۔ قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے۔ ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر استعداد اس سے فیض پاتے ہیں۔ وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن بابت فروری سنہ ۱۹۵۳ء)

اب اس سلسلہ میں ہمارے سامنے وہ اہم سوال آتا ہے جو اکثر ذہنوں کے لئے پریشانی کا موجب بنتا ہے۔ وہ سوال

دین کی جزئیات

یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثر و بیشتر دین کے اصول دیئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ یہ جزئیات نبی اکرمؐ نے متعین فرمائیں۔ اگر سنت رسول اللہ کو آئین کی بنیاد نہ قرار دیا جائے تو ان جزئیات کو کہاں سے لیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جب دین کے صرف اصول دیئے اور ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا تو کیا اس نے ایسا دانستہ کیا تھا یا یہ (معاذ اللہ) سہواً رہ گیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہم سے نہیں بلکہ مودودی صاحب کی زبان قلم سے سنئے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (جلد اوّل) کے صفحات ۵۰۸-۵۰۷ پر لکھتے ہیں۔

> ایک دوسری حدیث میں ہے ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ یہ اس کے کرم سے بھول لاحق ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔
>
> ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بہ سبیل اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی تفصیلات بتانی چاہئیں تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال بحال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا)۔ جن کے نقش قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں کی جزئیات و تفصیلات خود نہیں بتائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "وہ ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے"۔ خدا کی آخری کتاب کے لئے جسے اقوام عالم کے لئے، ہر ملک اور ہر زمانے میں ہمیشہ ضابطۂ حیات بننا تھا، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسے زندگی کے ایسے اصول دینے چاہئیں تھے جو ہر زمانے میں نوع انسان کے لئے راہ نمائی کا کام دے سکیں اور ان کی جزئیات کو چھوڑ دینا چاہئے تھا تاکہ ہر زمانے کے لوگ

اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان جزئیات کو خود مرتب کریں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے اور ان کی چار دیواری کے اندر مرتب کردہ جزئیات میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ انسانیت زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ علامہ اقبالؒ

جزئیات غیر متبدل نہیں ہوتیں

اس ضمن میں اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں رقمطراز ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر تشکیل پائے اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں ..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

قرآن کریم کے ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا نہ مقصودِ دین تھا نہ منشائے رسالت۔ یہ وجہ تھی کہ حضورؐ نے ان جزئیات کو مدون کر کے ان کا مجموعہ امت کو نہ دیا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ان جزئیات میں ردوبدل کیا گیا۔ (طلوع اسلام اس باب میں اس سے پہلے اس قدر تفصیل سے لکھ چکا ہے کہ اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات ان تفاصیل کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ 'اسلام میں قانون سازی کا اصول' دیکھ لیں) علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں۔

> احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علی حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ

معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ نے علی حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کرے۔ لیکن وہ مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انھیں کسی دوسری نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسے کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مفکر یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں ہو سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابوحنیفہؒ کے

طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین محققین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبال صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۳)

نبی اکرمؐ کے زمانے کے احکام میں تغیر و تبدل کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب اور جزئیاتِ دین

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارعؑ نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ میں ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں۔ ان کو ہوبہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔۔۔۔۔۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارعؑ کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارعؑ کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

(تفہیمات حصہ دوم۔ صـ ۳۲۷)

وہ اس کی تفصیل میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کبھی یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبِ سلف کی پیروی اس کا نام ہے کہ ـــــ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (FOSCILISED) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں۔ ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد پر وقت کی حرکت

اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے تقلید پسند مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہے درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم چلتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیر امت" جو بنایا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (REAR GUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں، بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر امت" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحابؓ کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانین طبعی کو قوانین شرعی کے تحت کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی — پس نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانین طبعی کے انکشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ (تنقیحات، ماہ۔ صفحہ ۱؎)

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "عبادات" کے علاوہ دیگر احکام کی جزئیات ہم خود متعین کر سکتے ہیں۔

اب رہے دیگر احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں بعض

۱؎ اس وقت اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ حوالہ میں کچھ فرق رہ گیا ہو۔

ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی، اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیئے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۳۲)

طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ آئین پاکستان کی اساس (بنیاد) قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کو قرار دیا جائے اور ان اصولوں کی جزئیات مرتب کرتے وقت ہم اس تمام ذخیرہ کو اپنے سامنے رکھیں جو اسلاف سے ہم تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں جو کچھ ایسا ہو جو ہماری ضروریات کو آج بھی پورا کرتا ہے اسے علیٰ حالہ رہنے دیا جائے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو اس میں تبدیلی کر لی جائے اور جو نئے معاملات سامنے آئیں ان کے لئے نئی جزئیات مرتب کر لی جائیں۔ مودودی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں۔

طلوع اسلام کی دعوت

اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اُس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہۃً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثے اور ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہ اور ائمہ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔

(تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۲۰۸)

مولانا اصلاحی کا مسلک یہ ہے کہ قرآن ہی میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں اور جزئیات کا تعین امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات و ضروریات کے تحت ہر نا گزیر تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں، اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل سنہ ۱۹۵۸ء)

نگہ باز گشت سنت رسول اللہ کے متعلق جو کچھ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ

(۱) "سنت کسے کہتے ہیں" اس کے متعلق یہ حضرات آپس میں متفق نہیں۔

(۲) ایسی کوئی کتاب نہیں جس میں سنت رسول اللہ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن، تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کے متن کی طرح "متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ حتیٰ کہ حدیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) مولانا اسماعیل صاحب (اور ان کے ہم مکتب علمائے اہل حدیث) کا مسلک اور عقیدہ یہ ہے کہ دین کی جزئیات بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسول اللہ کو عطا ہوئی تھیں۔ یہ جزئیات احادیث کے مجموعہ، بخاری و مسلم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے کسی حدیث کا انکار بھی کفر ہے اور کسی نئی بات کا اختیار کرنا بدعت۔ اسی کا نام سنت رسول اللہ ہے۔

(۴) مودودی صاحب کے نزدیک ہر حدیث سنت نہیں۔ سنت وہ ہے جسے رسول اللہ نے بہ حیثیت رسول فرمایا یا کیا ہو۔ اس کا فیصلہ مزاج شناس رسول کی نگہ بصیرت کر سکتی ہے کہ احادیث کی کتابوں میں جو کچھ آیا ہے اس میں کونسی حدیث صحیح اور کون سی غلط ہے۔ اور صحیح حدیثوں میں سے کون سی بات نبی اکرمؐ نے بہ حیثیت رسولؐ کی تھی اور کون سی اپنی شخصی حیثیت سے۔ جو باتیں حضورؐ نے بہ حیثیت رسول کی تھیں انہیں بھی بجز عبادات کے" ہو بہو قائم رکھنا مقصود نہیں۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اور نئے حوادث کے سلسلہ میں جدید جزئیات بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ اور

(۵) مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک "قرآن و حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائی تھیں ان میں سے سنت وہ ہیں جنہیں حضورؐ نے استمرار کیا ہو۔ ہنگامی حالات میں وقتی فیصلوں کے طور پر ارشاد نہ فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ کہ حضورؐ نے کون سی بات استمرار کی تھی اور کون سی ہنگامی حالات کے ماتحت، غالباً خود اصلاحی صاحب یا ان کے ہم مسلک حضرات کریں گے۔

"سنت" کے مفہوم کے متعلق اس قدر باہمدگر اختلافات کے باوجود، ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم نے آئین پاکستان کے متعلق متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے! اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک قدر مشترک صرف لفظ "سنت" ہے۔ اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ اگر طلوع اسلام چاہتا تو وہ بھی نہایت دھڑلے سے کہہ دیتا کہ آئین پاکستان کی بنیاد "کتاب و سنت" پر ہونی چاہیئے اور جب کوئی پوچھتا تو (مودودی صاحب کی طرح) کہہ دیتا کہ ہمارے نزدیک سنت وہی ہے جسے ہماری نگہ بصیرت سنت کہہ دے۔ اس طرح ان حضرات سے "سنت" کے مطالبہ کی ہمنوائی سے وہ بھی انہی کی طرح "حامیٔ سنت" قرار پا جاتا اور اس کے خلاف کوئی طوفان برپا نہ ہوتا۔ لیکن طلوع اسلام دین کے معاملہ میں اس قسم کے کھیل کھیلنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اللہ اس سے ہر ایک کو محفوظ رکھے۔

مولانا اسماعیل صاحب سے ایک سوال

اس مقام پر ہم (مثلاً جماعت اہل حدیث کے نمائندہ) مولانا اسماعیل صاحب سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس وقت تو آپ مطمئن ہیں کہ (مثلاً) مودودی صاحب نے "کتاب و سنت" کے مطابق میں آپ سے اتفاق کر لیا ہے۔ لیکن کل کو اگر پاکستان میں کوئی قانون نافذ ہوا اور اس کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ آیا وہ قانون "سنت" کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور مودودی صاحب نے اسناد سے بے نیاز ہو کر اپنی نگ بصیرت کے مطابق ایک حدیث پیش کر دی، تو کیا آپ اس حدیث کو صحیح حدیث تسلیم کر لیں گے اور اسے "سنت" قرار دیدیں گے؟

مودودی صاحب سے بھی

یہی سوال ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر اس وقت مولانا اسمٰعیل صاحب نے بخاری کی کوئی حدیث پیش کر دی تو کیا آپ اسے صحیح حدیث تسلیم کر لیں گے اور اسے واجب الاطاعت "سنت رسول اللہ" قرار دیں گے؟

یہی سوال مختلف فرقوں کے ان نمائندوں سے پوچھا جا سکتا ہے جنہوں نے اس متحدہ مطالبہ پر دستخط کئے ہیں کہ کیا وہ اس وقت کسی دوسرے فرقے کی طرف سے پیش کردہ حدیث کو صحیح تسلیم کر لیں گے؟

آپ حضرات کی طرف سے اس سوال کے جواب کے لئے طلوع اسلام کے صفحات کھلے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر قرآن کریم کو آئین کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس وقت کسی فرقے کی طرف سے قرآن کی کوئی آیت پیش کی جائے تو کوئی فرقہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں۔

قرآن کی تعبیر میں اختلاف

اس مقام پر یہ کہہ دیا جائے گا کہ قرآن کی آیت کے قرآنی آیت ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی تعبیر میں تو اختلاف ہوگا؛ چونکہ اس سوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ اسے یہ کہہ کر اچھالا جاتا ہے کہ اگر قرآن کریم کو قانون کی بنیاد قرار دے لیا تو امت میں جو کچھ رہا سہا اتحاد باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا) اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے بات کی جائے۔

(۱) قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ سورۃ نساء میں ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت اختلافات پاتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ دو مختلف باتوں کو قرآن کریم سے سند یا تائید مل ہی نہیں سکتی۔

(۲) اس نے کہا ہے کہ وہ آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے ہے۔

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ
وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں واضح طور پر بیان کردے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ (یوں) یہ قرآن ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اس کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۳) وہ تاکید کرتا ہے کہ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو۔ تمہیں وہاں سے حق فیصلہ مل جائے گا۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)

اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو۔ تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہے

(۴) اس کی رو سے اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس لئے جماعتِ مومنین سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایت آجانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

قرآن کریم کے ان واضح اعلانات کے بعد یہ کہنا کہ اگر قرآن کو آئین و قوانین کی بنیاد قرار دے لیا تو اس سے اختلافات بڑھ جائیں گے قرآن کے دعوے سے کھلا ہوا انکار ہے۔ اور اپنے تفرقہ اور اختلاف پر مصر رہنا اپنے آپ کو عذاب خداوندی میں مبتلا رکھنا ہے۔

قرآن فہمی کا طریق

قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کے لئے خود ہی اصول بیان کر دیئے ہیں (ان اصولوں کی طرف مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے جس کا اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے)۔ اگر قرآن کریم کو خود قرآن کریم ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے احکام و قوانین کے سمجھنے میں اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو آپ اس وقت مختلف فرقوں میں اختلاف دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کریم ان میں سے ہر ایک کو اس کے مسلک کی تائید بہم پہنچا رہا ہے اگر ایسا ہو تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعوے ہی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف فرقے، قرآن کریم کو خارج از قرآن

چیزوں کے تابع رکھتے ہیں یعنی یہ فرقے اپنے اپنے احکام و قوانین کو خارج از قرآن سرچشموں سے لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن کی طرف آتے ہیں۔ اگر انھیں ان احکام و قوانین کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت مل جاتی ہے تو اسے بھی تائیداً ساتھ رکھ لیتے ہیں اگر قرآن کی آیت اس کے خلاف جاتی ہے تو اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اس حکم کے مطابق دکھائی دے۔ اور اگر ایسا ناممکن ہو تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ آپ اصحاب حدیث کا یہ عقیدہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ باقی رہے اہل فقہ (حنفی حضرات) تو ان کے پیشوا اور

فقہ اور قرآن

مسلّم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا یہ قول ان کے عقیدہ کو واضح کرتا ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماؤل ہے یا منسوخ ہے اور
>
> اس طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماؤل یا منسوخ ہے۔ (علامہ الخضری۔ ص ۱۲۱)

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ جس چیز کو قرآن کی تعبیر میں اختلاف کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن کی تعبیر کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جن چیزوں کو مختلف فرقوں نے قرآن پر قاضی اور حاکم بلکہ اس کا ناسخ قرار دے رکھا ہے وہ ان چیزوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف ہوتا ہے فرقوں کی باہمی ضد کی وجہ سے۔

> وَآتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ .... (۴۵/۱۷)
>
> اور ہم نے انھیں اس معاملہ (دین) کے متعلق واضح باتیں دی تھیں۔ لیکن انھوں نے العلم (وحی) آ جانے کے بعد آپس میں اختلاف کیا۔ اور اس اختلاف کی وجہ محض ان کی باہمی ضد تھی۔

اگر فرقہ بندی کی باہمی ضد کو الگ رکھ کر، امت خالص قرآن کی طرف آ جائے تو اس کے احکام و قوانین[1] میں کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے لئے جو ضابطہ عطا فرمایا ہے اگر وہ بھی صاف، واضح اور متعین نہیں تو

---

[1] قرآن کریم میں زندگی کے لئے اصول، قوانین اور احکام بھی ہیں اور حقائق کائنات اور مابعد الطبیعاتی امور بھی۔ جہاں تک اصول، قوانین و احکام کا تعلق ہے انھیں قانون کی زبان میں بیان کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کے ابہام یا ذو معنی ہونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جہاں تک کائناتی حقائق وغیرہ کا تعلق ہے، انھیں قرآن نے تشبیہات و استعارات کی زبان میں بیان کیا ہے تاکہ جوں جوں انسانی علم میں وسعت آتی جائے، ان کا مفہوم واضح سے واضح تر ہوتا جائے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (۴/۲۳) "تم پر تمہاری مائیں حرام قرار دی گئی ہیں۔" یہ حکم بالکل واضح اور متعین ہے۔ اس میں صرف یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ ماؤں سے مراد حقیقی مائیں ہیں یا سوتیلی مائیں بھی اس کے اندر آ جاتی ہیں۔ اس کے لئے اس سے ماسبق آیت میں کہہ دیا کہ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۲۲) ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔ اس سے بات صاف کر دی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر اس کے اس دعوے کا (معاذاللہ) کچھ مطلب ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے صاف۔ واضح۔ مکمل۔ واحد اور آخری ضابطہ حیات ہے۔

فرقہ اہلِ قرآن

بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ فرقہ اہلِ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن خالص سے احکام متعین کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ ایسا کہنے والوں کو دراصل اس کا علم نہیں کہ فرقہ اہلِ قرآن نے کون سی باتیں، قرآن سے متعین کرنے کی کوشش کی اور ان میں باہمی اختلاف ہوا؟ قرآن نے جن امور کو محض اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ یہ فرقہ ان کی جزئیات کو بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن میں ہوں ہی نہ، اگر کوئی انہیں بھی قرآن سے متعین کرنے بیٹھ جائے تو ان میں اختلاف نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ جو لوگ یہ متعین کرنا چاہیں کہ قرآن کی رو سے (مثلاً) رکوع میں کون سی تسبیح پڑھنی چاہیئے' ان میں اختلاف کے سوا اور کیا ہوگا۔ فرقہ اہلِ قرآن کی یہی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ناکام رہا اور اس کی وجہ سے قرآن بدنام ہو گیا۔ قرآن نے زندگی کے جو اصول و احکام دیئے ہیں' وہ صاف اور واضح ہیں۔ جن جزئیات سے وہ خاموش رہا ہے ان کے متعلق اس کی تعلیم یہ ہے کہ انہیں امت باہمی مشورہ سے مرتب کرے۔ اس طریق کو اختیار کیجئے' اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے؟ اس دعویٰ کا زندہ ثبوت خود عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ ہے جس میں اس طریق کو اختیار کیا گیا اور امت میں کوئی اختلاف (یا فرقہ) پیدا نہ ہوا۔

اگر یہ واقعہ بھی ہو کہ فرقہ اہلِ قرآن۔ یا کسی اور کو قرآن کریم کے کسی حکم کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ (معاذاللہ) قرآن کریم میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح کر سکے اور اس میں اختلافی باتیں موجود ہیں۔ اس سے تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان ہی نہیں رہتا۔ بہرحال' اتنا واضح ہے کہ قرآن کی صورت میں یہ سوال سامنے نہیں آئے گا کہ فلاں آیت قرآن کی ہے یا نہیں۔ لیکن حدیث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جس چیز کو حدیث کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔ اس کے مفہوم کا سوال بعد

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) دوسری طرف یہ آیت ہے کہ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۱۱/۷) اس آیت کا تعلق احکام سے نہیں بلکہ حقائق سے ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے "اس کا عرش پانی پر ہے"۔ اگر ان الفاظ کے عام معنی مراد لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ بادشاہوں کے تختوں کی طرح خدا کا بھی ایک تخت ہے اور وہ پانی پر تیرتا ہے۔ لیکن اگر ان کے مجازی معنی لئے جائیں تو عرش سے مراد خدا کا اقتدار اور کنٹرول ہوگا۔ باقی رہا ماء تو اس کے متعلق قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱/۳۰) "ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا"۔ تو اس کا مطلب ہوگا زندگی کا سرچشمہ۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زندگی کے سرچشمہ پر کنٹرول خدا کا ہے۔ یہ مثال ہے حقائق سے متعلق قرآن کے انداز کی۔ حقائق کے سمجھنے میں علی قدر علم اختلاف ہو سکتا ہے لیکن احکام میں نہیں۔ حقائقِ کائنات کے سمجھنے میں اختلاف سے ملت میں انتشار نہیں پیدا ہوتا۔ انتشار اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مختلف فرقے اپنے اپنے لئے الگ قوانین تجویز کریں۔ ایسی صورت میں انتشار تو ایک طرف، ملت قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے فرقوں کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن باتوں کو ایک فرقہ صحیح احادیث قرار دیتا ہے دوسرا فرقہ انہیں صحیح حدیثیں سمجھتا ہی نہیں۔

شخصی قوانین اب رہا حضرات علمائے کرام کا یہ مطالبہ کہ جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کا تعلق ہے ہر مسلک فرقہ کو اجازت ہو کہ وہ کتاب و سنت کی تعبیر اپنے عقیدہ کے مطابق کرے اس باب میں گذارش ہے کہ کیا یہ حضرات کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ (جسے بھی وہ اپنے عقیدہ کے مطابق سنت سمجھتے ہوں) اس امر کا اشارہ تک بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اسلام شخصی قوانین اور ملکی قوانین میں تفریق کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور اس دور میں پیدا ہوا جب سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا گیا۔ ملکی قوانین، اہل سیاست نے اپنے پاس رکھے اور شخصی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کی طرف منتقل کر دیا۔ ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت آئی تو انہوں نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس کے مطابق انہوں نے ملک کے قوانین اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی معاملات، قانون شریعت کے مطابق طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں، ہمارے ہاں ملکی اور شخصی قوانین کی تفریق زندہ رہی۔ اب خدا کے فضل سے ہماری اپنی آزاد مملکت ہے جس کے لئے اسلامی آئین کی تدوین کا سوال زیر غور ہے۔ اس مملکت میں ہمارے علمائے کرام اس ثنویت کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے کی کوششیں فرما رہے ہیں جو دور ملوکیت میں پیدا ہوئی اور انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں پروان چڑھی! یا للعجب۔

اس ثنویت میں مودودی صاحب تو اس حد تک آگے چل گئے ہیں کہ ان کے نزدیک نماز۔ روزہ وغیرہ تو دین سے متعلق ہیں اور معاشی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ سیاسی مسائل کا براہ راست دین سے تعلق ہی نہیں۔ چنانچہ وہ تفہیمات۔ حصہ اول۔ ص ۲۷۹ پر لکھتے ہیں۔

> مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اتباع کا عام حکم دینے سے یہ مراد نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا، لوگ بھی بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں۔ اور اپنی زندگی میں آپ کی حیات طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد قرآن کا ہو نہیں سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضور کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جب

طرح خود عمل کر کے بتایا ہے۔ اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازمی ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً تمدنی۔ معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہم کو مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے اور ہم آپ کے طریقے کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیئے اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کیے جانے چاہئیں اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کیے جانے چاہئیں۔

فرقوں کا وجود

باقی رہا فرقوں کا وجود تو قرآن کریم نے بالفاظِ صریح اسے شرک قرار دیا ہے۔ اسے مسلمانوں سے تاکیداً کہا کہ دیکھنا! تم نے مسلکِ توحید اختیار کرنے کے بعد کہیں مشرک نہ ہو جانا۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ. (۳۰/۳۲)

تم نے مشرکوں میں سے ہو جانا یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔ اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ پھر حالت یہ ہو گئی کہ تمام فرقے اپنے اپنے مسلک پر اترا رہے ہیں۔

اس نے نبی اکرمؐ سے برملا کہہ دیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹)

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہ بن گئے۔ (اے رسول) تیرا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔

ان نصوص صریحہ کی موجودگی میں فرقوں کی گرہوں کو آئینی طور پر مضبوط کرانے کی کوشش کرنا آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ کیا کہلائیگا! ہمیں تسلیم ہے کہ آج ہم میں فرقے موجود ہیں۔ اسے بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقے شتاب شتاب نہیں مٹ سکتے۔ اس لئے ان کے وجود کو سردست، اضطراری طور پر گوارہ کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم جس قدر جلد ممکن ہو اس "مشرکانہ حالت" سے نکل کر وحدت کی منزل میں پہنچ جائیں۔ اس کے لئے اولین قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم آئینی طور پر امت میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کرنے کی تجاویز عمل میں لائیں اور اپنا نصاب تعلیم اس انداز کا مرتب کریں کہ ہماری

آنے والی نسلیں، خود بخود تفرقہ کی حالت کو چھوڑ کر، امت کی وحدت میں گم ہو جائیں۔ اس وقت نہ شخصی اور ملکی قوانین کی تفریق باقی رہے گی۔ نہ عبادات اور معاملات میں فرق کیا جائے گا۔ ایک خدا کی کتاب۔ ایک امت اور ایک نظام زندگی اسے کہیں گے اسلامی معاشرہ۔

فرقوں کے وجود کو بامر مجبوری علی حالہ رہنے دینے سے مطلب یہ ہے کہ جس جس طریق سے کوئی فرقہ اپنے ہاں نماز وغیرہ ادا کرتا ہے اس میں سردست دخل نہ دیا جائے۔ یاد رہے کہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ "عبادت" کے معنی احکام خداوندی کی اطاعت ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں مختلف فرقوں نے "عبادت" (یعنی پرستش) کے طور طریقوں کو اپنا امتیازی نشان قرار دے رکھا ہے اس لئے جب تک فرقوں کا وجود برداشت کیا جائے گا اس وقت تک ان کی "عبادت" کے طور طریق سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ تاآنکہ کچھ وقت کے بعد ہماری آنے والی نسلیں خود محسوس کر لیں کہ دین میں اس تفریق کی قطعاً اجازت نہیں۔ اس وقت نماز کا بھی ایک ہی طریقہ ہوگا۔ اور جس طرح قرن اول میں ہوتا تھا امام، خود حکومت کے سربراہ ہوں گے۔ طلوع اسلام کی یہ دعوت بھی کچھ نئی نہیں وہ پہلے دن سے اعلان کرتا چلا آرہا ہے کہ

> امت کے مختلف فرقے نماز، روزہ وغیرہ میں جس جس طریق پر عمل پیرا چلے آرہے ہیں اس میں ردوبدل کرنے کا حق کسی فرد کو نہیں۔

خود طلوع اسلام نے نماز کا کوئی نیا طریقہ وضع نہیں کیا۔ کوئی نئی فقہ ایجاد نہیں کی۔ اس نے مملکت کے آئین کے بارے میں جو کہا ہے کہ اس کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر ہونی چاہیئے تو اس لئے کہ وہ ان حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکتا جن کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

آپ حضرات سے ہماری دردمندانہ گذارش ہے کہ آپ بھی ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ جن مختلف الخیال لوگوں نے "کتاب وسنت" کے مطالبہ پر متفقہ طور پر دستخط کئے ہیں (یا جو بعد میں ان کے ہم نوا بنیں گے) جب ملک میں قانون سازی کا وقت آئے گا تو اس وقت یہ کس طرح ایک دوسرے کے مقابل نہیں کھڑے ہوں گے۔ جس حنفی عالم کی آج کیفیت یہ ہے کہ وہ (مثلاً) اہل حدیث کے مسنون طریقے کے مطابق نماز پڑھنے کے لئے تیار نہیں کیا وہ اس کے لئے تیار ہو جائے گا کہ جس ملکی قانون کو اہل حدیث مطابق سنت قرار دیں، اسے وہ بھی قانون شریعت تسلیم کر لے؟ اس وقت اگر ارباب حل وعقد نے یہ کہہ دیا کہ آپ حضرات کی اس چپقلش سے ملک کے نظم ونسق کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی اس لئے ہم ملکی قوانین کو آپ کے چنگل سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں تو سوچئے کہ اس طرح ملک پر نافذ ہونے والے سیکولر نظام کی ذمہ داری کس پر عاید ہوگی؟ ارباب حل وعقد کو فرنگی مآب، یورپ زدہ، مادہ پرست کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ ایسے حالات میں اور کیا کیا جا سکے گا؟ محض "کتاب وسنت" کا مطالبہ کر دینے سے آپ حضرات

اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ذرا یہ بھی تو بتا دیجئے کہ اس کے مطابق ملک کی قانون سازی کی عملی شکل کیا ہوگی؟

نماز کی متفق علیہ شکل

جب یہ حقیقت ہے کہ انہیں (چھوڑئیے) آئیں سو علماء بھی، اور تو اور، نماز تک کی کوئی متفق علیہ مسنون شکل بھی متعین نہیں کر سکتے، تو سوچئے کہ سنت کے مطابق ملک کا متفق علیہ قانون کس طرح سے بن سکے گا؟ ان حالات میں پاکستان میں اسلامی آئین و قوانین کی ترتیب کی ایک ہی شکل

پس چہ باید کرد

ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کو (جس کے متن کے متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہونے میں کسی کو کلام نہیں) مملکت کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس کے احکام و قوانین کی تعبیر میں خارج از قرآن کسی چیز کو قرآن پر حاکم اور قاضی نہ تصور کیا جائے۔ یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہماری تمام مشکلات کس طرح حل نہیں ہو جاتیں۔ اس لئے کہ (مودودی صاحب کے الفاظ میں)

> دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو ہر اشتباہ سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔
>
> (۲) جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسانی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے اور وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔
>
> (۳) حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوندی ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

لہٰذا اس سے تو امید ہے کہ آپ بھی متفق ہوں گے کہ جو قانون قرآن کریم کے مطابق بنے گا وہ سنت رسول اللہ کے بھی عین مطابق ہوگا۔

دعا کیجئے کہ تاریخ کے اس نازک ترین دور میں اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے اپنے تعصبات، میلانات و رجحانات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے حقائق کا جائزہ لیں اور ایسی صورت نہ پیدا ہونے دیں جس سے بروز حشر اسلام ہمیں یہ کہہ کر مطعون کرے کہ تمہاری ضد کی وجہ سے مملکت پاکستان میں میرا سکہ رواں نہ ہو سکا۔

پھر سُن لیجئے!

چونکہ یہ مقالہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ جو نکات شروع میں بیان کئے گئے ہیں آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ آپ کے ذہن میں مستحضر نہ رہے ہوں۔ اس بنا پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے۔ تاکہ ساری بات بیک وقت آپ کے ذہن میں آ جائے۔ ان مختصر الفاظ کو غور سے پڑھیئے گا۔

(۱) اس وقت پاکستان کے لئے جدید آئین مرتب کرنے کا سوال زیر غور ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے

(۲) ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو چاہتا ہے کہ یہاں کا آئین 'سیکولر انداز' کا ہو۔ 'سیکولر انداز' کے معنی یہ ہیں کہ مملکت جس قسم کے قوانین و ضوابط مناسب سمجھے بنا لے۔ اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو۔

(۳) طلوع اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہونا چاہیئے۔ 'اسلامی آئین' کے معنی یہ ہیں کہ مملکت ان حدود کے اندر ہتی ہوئی تمام کاروبار انجام دے جو اسلام نے عاید کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ حدود کونسی ہیں۔

(۴) طلوع اسلام کا کہنا ہے کہ جو حدود قرآن کریم نے مقرر کی ہیں، مملکت ان سے باہر نہ جا سکے۔

(۵) قرآن کریم وہ کتاب ہے جو حرفاً حرفاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرمؐ کو دیا۔ اور جسے نبی اکرمؐ نے امت کو دیا قرآن کریم کے متن کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں یعنی جب قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کی جائے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں ہے۔ اگر قرآن کریم کو مملکت کا حاکم اعلیٰ قرار دیا جائے تو اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

(۶) ہمارے علمائے کرام کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ "سنت" کو بھی مملکت کا حاکم اعلیٰ قرار دیا جائے۔ بظاہر یہ مطالبہ بہت خوش آئند دکھائی دیتا ہے۔ اور جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مطالبہ ممکن العمل بھی ہے؟

(۷) سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ 'سنت' کہتے کسے ہیں؟ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہونگے کہ جن علمائے کرام نے اس مطالبہ پر دستخط کئے ہیں وہ خود بھی اس سوال کے جواب پر متفق نہیں کہ سنت کسے کہتے ہیں۔ ایک کا کہنا ہے کہ

نبی اکرمؐ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا یا ارشاد فرمایا، یا جس کام کو دیکھ کر آپؐ خاموش رہے۔ وہ سب سنت ہے

دوسرے کا کہنا ہے کہ

نہیں۔ رسول اللہؐ نے جو کچھ بحیثیت رسول کیا تھا صرف وہ "سنت" ہے جو کچھ آپؐ نے شخصی حیثیت سے کیا تھا وہ سنت میں داخل نہیں

تیسرے کا خیال ہے کہ

جو کچھ رسول اللہؐ نے دوامًا یا التزامًا کیا ہے وہ سنت ہے جو کچھ وقتی طور پر کسی ہنگامی معاملہ کے تصفیہ کیلئے کیا تھا وہ سنت میں داخل نہیں

(۸) پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت رسول اللہؐ پر بعینہٖ عمل کیا جانا ضروری ہے یا اس میں حالات کے مطابق تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک

سنت رسول اللہؐ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے کا خیال ہے کہ

عبادات میں تو سنت رسول اللہ کا من وعن اتباع ضروری ہے لیکن معاملات میں اس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

(۹) اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت رسول اللہ ملے گی کہاں سے؟ ایک کا کہنا ہے کہ

بخاری اور مسلم شریف میں جو کچھ ہے وہ سب صحیح ہے۔ جبریل امین اسے بھی قرآن کی طرح لیکر نازل ہوئے تھے۔ ان کتابوں کی مندرج احادیث میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ جو شخص ان کا انکار کرتا ہے وہ کفر کا مرتکب ہے۔

دوسرے کا خیال ہے کہ

یہ غلط ہے یہ کتابیں انسانوں سے انسانوں تک پہنچی ہیں۔ ان میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ صرف صحیح حدیثوں کو مانا جائیگا غلط کو نہیں۔

(۱۰) اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح اور غلط حدیثوں کی پرکھ کس طرح سے ہو۔ ایک اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ

حدیثوں کی پرکھ اس سے پہلے ہو چکی ہے۔ ائمہ سلف نے جن احادیث کو صحیح قرار دیدیا ہے وہ سب صحیح ہیں۔ اب ان پر تنقید نہیں کی جاسکتی۔

دوسرا کہتا ہے کہ

یہ غلط ہے۔ ائمہ بھی ہماری طرح کے انسان تھے۔ وہ بھی غلطی کر سکتے تھے اسلئے انکی پرکھ ہمارے لئے حرف آخر نہیں ہو سکتی ہم خود انکی پرکھ کرینگے۔

پوچھا گیا کہ ان کی پرکھ کا طریقہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ

اسلام کا گہرا مطالعہ کرنے سے انسان میں اس قسم کی نگاہ پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں فوراً امتیاز کر لیتا ہے۔ اس قسم کے ذوق کی نگاہ بتا سکے گی کہ صحیح حدیث کونسی ہے اور غلط کونسی؟

(۱۱) سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر قرآن اور حدیث میں اختلاف نظر آئے تو اس وقت عمل کس پر کیا جائے؟ جواب ملا کہ اس وقت عمل حدیث پر کیا جائے گا کیونکہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۱۲) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ

قرآن کی آیت ہو یا حدیث رسول اللہ اگر وہ ہمارے ائمہ کے کسی قول کے خلاف ہو تو اس آیت یا حدیث کی تاویل کی جائیگی اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اسے منسوخ سمجھا جائیگا۔

(۱۳) اس ساری بحث کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ

کیا کتاب و سنت دونوں کو سامنے رکھنے سے یہ ممکن ہوگا کہ سارے ملک کے لئے متفق علیہ قانون مرتب کر لیا جائے۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ

ایسا ممکن نہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ قانون کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ ایک شخصی اور دوسرا ملکی قانون۔ جہاں تک شخصی قانون کا تعلق ہے ہر فرقے کو اجازت دی جائے کہ وہ کتاب و سنت کی تعبیر اپنے اپنے مسلک کے مطابق کرے۔

(۱۴) اس سے لازمی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ شخصی قانون کے لئے تو کتاب و سنت کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی تسلیم کر لی جائے لیکن ملکی قوانین کیلئے کتاب و سنت کی کونسی تعبیر صحیح تسلیم کی جائے؟ اس کا جواب غالباً یہ دیا جائیگا کہ جس تعبیر کو تمام فرقے متفقہ طور پر صحیح قرار دیں اسے تسلیم کیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب شخصی قانون جیسے معاملے میں تمام فرقے کتاب و سنت کی متفقہ تعبیر پیش نہیں کر سکتے تو ملکی قوانین کی صورت میں وہ ایسا کس طرح کر سکیں گے؟

(۱۵) یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ

(۱) جب قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے تو پھر فرقہ بندی کی گرہوں کو آئینی طور پر تسلیم کرتے جانا، کس طرح اسلام کے مطابق ہوگا۔ اور

(۲) کیا قرآن کریم یا سنت رسول اللہ نے شخصی اور ملکی قوانین میں فرق کیا ہے؟

(۱۶) اس مسئلہ کا دوسرا غور طلب پہلو یہ ہے کہ

(۱) یہ واقعہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔ آپ نے صرف قرآن ہی امت کو دیا۔

(۲) خلفائے راشدینؓ نے بھی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا بلکہ جب یہ سوال پیش ہوا تو انھوں نے بڑے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس، انھوں نے قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں اس قدر سرگرمی کا ثبوت دیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قرآن کریم کے کم از کم ایک لاکھ نسخے مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔

(۳) احادیث کے موجودہ مجموعے نبی اکرمؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد انفرادی کوششوں سے مرتب ہوئے اور دوسرے لوگوں نے انفرادی طور پر ان کے پرکھنے کی کوشش کی۔ جن احادیث کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے ان کے ساتھ خدا کی سند ہے نہ خدا کے رسولؐ کی (کہ وہ ارشادات واقعی رسول اللہؐ کے ہیں)۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر احادیث کو قرآن کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اطاعت کا ضابطہ بننا تھا تو رسول اللہؐ نے ان احادیث کا مجموعہ مرتب کر کے امت کو کیوں نہ دیا تاکہ اسے ان احادیث کے بارے میں اس قدر انتشار اور اختلاف نہ ہوتا۔ اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دیتا۔

(۱۷) ان حالات پر غور کرنے سے انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کا منشا یہی تھا کہ قرآن کریم کو امت کے لئے ضابطۂ اطاعت قرار دیا جائے۔

(۱۸) طلوعِ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیادی شق یہ رکھی جائے کہ

مملکت اپنا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے اور ملک میں کوئی قانون ایسا نہ بنے جو قرآن کے خلاف ہو۔ ظاہر ہے کہ جو قانون قرآن کے خلاف نہیں ہوگا وہ سنت رسول اللہ کے بھی خلاف نہیں ہوگا۔

(۱۹) اگرچہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں لیکن جس حالت میں ہم آج ہیں اس میں بامر مجبوری مجبوری کے دور کے لئے ہر فرقہ کو اجازت ہوگی کہ وہ عبادات کو اپنے اپنے طریق کے مطابق ادا کر لیا کرے۔

(۲۰) اگر اس طریق کے مطابق ہمارا آئین مرتب ہو جائے تو ہم اس منزل کی طرف پہلا قدم اٹھا سکیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور علمائے کرام کا یہی اختلاف قائم رہا تو قانون سازی کی گاڑی ایک قدم نہیں چل سکے گی۔ اس سے خطرہ ہے کہ مملکت کے ارباب حل و عقد تنگ آ کر یہ کہہ دیں کہ تم شخصی قانون کو کتاب و سنت کی اپنی اپنی تعبیر کے مطابق طے کرتے رہو ملکی قانون کو ہم آزادانہ مرتب کریں گے۔ اسی کا نام سیکولر حکومت ہوتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود ہی سوچئے کہ طلوعِ اسلام نے جو مطالبہ پیش کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

لُغاتُ القرآن

(جلد اوّل)

قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفتیشی کاوشوں کا جگمگاتا ہوا شاہکار

جس کا برسوں سے شدید انتظار تھا

قرآن کے الفاظ — قرآن کے تصوّرات — قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصّہ اوّل میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکیں گے۔

جن احباب نے یہ علم افروز کتاب حاصل نہیں کی

وہ اسے جلد حاصل کریں۔ کیونکہ ایسی نادر کتب بار بار طبع نہیں ہوتیں!!

ٹائپ کی حسین و دلآویز طباعت۔ بہترین سفید کاغذ۔ پائیدار سنہری دیدہ زیب جلد

قیمت:۔ پندرہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

شائع کنندہ:۔ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

پرویز صاحب کی بے مثال تصنیف

"انسان نے کیا سوچا؟"

پر

پاکستان کے ممتاز جرائد کا تبصرہ

مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرین عالم کے خیالات کو ترتیب دیکر ایک واضح تصویر پیش کی ہے...... یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں اس گمراہی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے چار سو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے اور فاضل مصنف کے تبحر علمی کا ثبوت۔

(ہفت روزہ "قندیل" لاہور ۸ رمئی [illegible])

پرویز صاحب کی زیر نظر تخلیق ان تفکرات و تردودات کا ایسا بے لاگ، بے لوث اور بالواسطہ مبسوط مدلل حل اور جواب ہے جسے مؤلف نے کہیں اپنی ذاتی رائے یا ذاتی دلائل کے تاثر سے مرعوب و آلودہ کرنے کی کوشش نہیں کی تفہیم و اصلاح و ارشاد کا انداز اس قدر غیر محسوس کہ قاری کسی تلقین و تاکید کے بغیر انجام کار اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو مؤلف کا منتہا و مقصود ہے۔ زبان نہایت صاف، انداز بیان نہایت سلیس، تفہیمی اور دلنشیں ہے۔ ٹائپ صاف، طباعت ستھری، کاغذ نفیس، گرد پوش دو رنگا نستعلیق۔

(ہفت روزہ "لاہور" لاہور ۹ رمئی [illegible])

قیمت:- بارہ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

شائع کردہ:- ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی۔ گلبرگ ——— لاہور

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوع اسلام ۲۶-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

ضبطِ ولادت

(خاندانی منصوبہ بندی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضبطِ ولادت

(خاندانی منصوبہ بندی)

آجکل دنیا میں جس مسئلہ نے (ایٹم بم کے بعد) اقوامِ عالم کی توجہات کو سب سے زیادہ اپنی طرف مرکوز کر رکھا ہے وہ برتھ کنٹرول یا ضبطِ ولادت ہے۔ اس سے پہلے ضبطِ ولادت کے آلات و ادویات یا طرق و ذرائع محض انفرادی دلچسپی کا موجب تھے۔ لیکن اب انھوں نے اجتماعی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اسی نسبت سے اس مسئلہ کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔ اُس وقت مانع حمل تدابیر یا عموماً اس مقصد کے لئے استعمال کی جاتی تھیں کہ ناجائز جنسی اختلاط پر ہر تصدیق ثبت نہ ہونے پائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت یہ تدابیر بعض حالات میں جائز مقاصد کے لئے بھی استعمال کی جاتی تھیں ـــــ مثلاً بیوی کی صحت کے پیشِ نظر ـــــ لیکن ان کا عمومی مقصد ناجائز تعلقات کے نتائج و عواقب سے محفوظ رہنا ہی تھا۔ اب اس مسئلہ نے اور شکل اختیار کر لی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس رفتار سے دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے زمین کی پیداوار (یعنی سامانِ خورد و نوش) میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہو رہا ـــــ نہ ہی سردست (یا یوں کہیئے کہ فوری طور پر) ایسا کیا جانا ممکن ہے۔ اس لئے خدشہ یہ ہے کہ اگر صورتِ حالات کچھ وقت تک یہی رہی تو دنیا بھوک سے مر جائے گی۔ اس مشکل اور خدشہ کے پیشِ نظر سوچا یہ جا رہا ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے آبادی کا یہ بے محابا اضافہ محدود ہو جائے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی (یا FAMILY PLANNING) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہ ہوگا (جس طرح آجکل ہمارے ہاں ہو رہا ہے) ایک میاں بیوی کے ہاں جتنے بچے پیدا ہو سکتے ہیں، ہوتے چلے جائیں۔ بلکہ ملک میں سامانِ خوراک کی نسبت سے بچوں کی تعداد کی حد بندی کر دی جائے۔

دیگر اقوامِ عالم اس مسئلہ پر قومی مصالح کی روشنی میں غور و فکر کر رہی ہیں۔ یعنی وہ یہ سوچتی ہیں کہ اس سوال کا قومی معیشت ملکی سیاست اور عوام کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ لیکن ہمیں اس پر ان مصالح کے علاوہ) ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنا ہوگا۔

یعنی یہ کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہے؟ ہمارے مذہبی طبقہ میں، اس سلسلہ میں دو گروہ سامنے آرہے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ ضبطِ ولادت بالکل جائز ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ قطعاً ناجائز ہے۔ اس حد تک ناجائز کہ

> ایسی کوئی تحریک اگر آنحضرت کے سامنے اٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اس کے خلاف ایسا ہی جہاد کرتے جیسا شرک و بت پرستی کے خلاف آپ نے کیا۔
>
> (ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۰ء۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب)

جو گروہ ضبطِ ولادت کو جائز قرار دیتا ہے، وہ اپنے خیال کی تائید میں وہ احادیث پیش کرتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے عزل کی اجازت دی تھی۔ دوسرا گروہ ان احادیث کی صحت سے تو انکار نہیں کرتا لیکن کہتا یہ ہے کہ

> عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرتؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبی (ص) سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ (ایضاً)

ہمارے نزدیک عزل سے متعلق روایات سے اس مسئلہ کے جواز یا عدمِ جواز کی سند پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے، اس لئے کہ یہ روایات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اطہر کی طرف ان کی نسبت کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ عزل سے متعلق بخاری کی ایک روایت یہ ہے۔

> حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی (ص) کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے) یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں، پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو۔ تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو۔ اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی۔[1]

دوسری روایت یہ ہے کہ

> ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے کچھ دریافت کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبی (ص) کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔

---

[1] بخاری جلد اول۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی۔ ص ۲۹۲۔

پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ پالیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسولِ خدا (ص) سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا اگر تم یہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہو گی۔[1]

یہ روایات کسی تبصرہ اور اپنے وضعی ہونے کے لئے کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ ہمارے نزدیک انھیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی جسارت اور حضورؐ کی شانِ اقدس میں انتہائی سوءِ ادبی ہے۔

مذہبی طبقہ کی طرف سے ضبطِ ولادت کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہیں کہ

(۱) اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

(۲) یہ قتلِ اولاد ہے جو اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔

(۳) بھوک کے خوف سے ایسا کرنا خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس سوال (ضبطِ ولادت) کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کریں، مختصر طور پر مندرجہ بالا اعتراضات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اوّل تو یہ دیکھئے کہ یہ اعتراض "ضبطِ ولادت" کے خلاف نہیں بلکہ ان تدابیر کے خلاف ہے جو عام طور پر اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ضبطِ ولادت کا مسلک اختیار کرتا ہے لیکن حرامکاری سے بچا رہتا ہے، تو اس کا یہ مسلک اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیسا ہوگا۔ اگر یہ مسلک جائز ہوگا تو پھر ضبطِ ولادت کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اعتراض ان تدابیر کے خلاف ہونا چاہیئے جن سے حرامکاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر ضبطِ ولادت بہرحال ناجائز ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کے لئے ذرائع کس قسم کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر ضبطِ ولادت ناجائز نہیں، اور ملک کے اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر اس کا اختیار کیا جانا ضروری ہے تو پھر سوچنا یہ چاہیئے کہ

(۱) اس کے لئے ذرائع ایسے اختیار کئے جائیں جو حرامکاری پھیلانے کا سبب نہ بن سکیں۔ اور

(۲) اگر سرِدست ایسے ذرائع میسر نہیں آ سکتے تو ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے لوگ ان ذرائع کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

یہ دلیل کہ چونکہ لوگ ان ذرائع کا غلط استعمال کریں گے اس لئے اصل مقصد ہی کو ختم کر دینا چاہیئے، جس قسم کا وزن رکھتی ہے اہلِ علم و دانش کے لئے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے (مثلاً) یہ تجویز کیا جائے کہ چونکہ لوگ بلا ٹکٹ سفر کرتے ہیں

---

[1] بخاری جلد اول ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی ۔ ۵۴۲

اس لئے ریلوں کو بند کر دیا جائے۔ یا عورتیں مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر خودکشی کر لیتی ہیں، اس لئے مٹی کے تیل کا استعمال (بلکہ دیا سلائی کا بھی کہ ماچس کا استعمال) ممنوع قرار دیا جائے۔ یا ملک میں آئے دن چاقو چلنے کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں اس لئے چاقو بننے بند کر دینے چاہئیں۔ حتیٰ کہ اس دلیل کو اور آگے بڑھایا جائے تو کہہ دیا جا سکتا ہے کہ چونکہ حرامکاری بہرحال عورتوں کی موجودگی سے ہوتی ہے اس لئے حرامکاری کو بند کرنے کے لئے تمام عورتوں کو ملک بدر کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ اگر ضبطِ ولادت فی نفسہٖ ناجائز نہیں، تو پھر ہمارے لئے سوچنے کی بات صرف یہ ہوگی کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کیا اختیار کئے جائیں۔ اور وہ کون سی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان ذرائع کا غلط استعمال نہ ہو۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ "قتلِ اولاد" ہے۔ یعنی اگر جنسی اختلاط کیا جائے اور حمل قرار نہ پانے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں۔ یہ اعتراض بے حد کمزور ہے۔ اولاً یہ کہ جو بچہ وجود ہی میں نہیں آیا اسے قتل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے مادۂ تولید میں بچہ بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر استقرارِ حمل روک دیا جائے تو وہ صلاحیت محسوس پیکر اختیار نہیں کرتی اس لئے یہ قتلِ اولاد ہے۔ تو اس دلیل کا بودا پن واضح ہے۔ مثلاً

(۱) اگر ایک شخص جوان ہو جانے کے باوجود نکاح نہیں کرتا۔ یا دیر میں نکاح کرتا ہے تو اسے بھی قتلِ اولاد کا مرتکب قرار پانا چاہئے۔ اس لئے کہ اس نے اپنے اس عمل سے نہ معلوم کتنے بچوں کو وجود میں آنے سے روک دیا!

(۲) مادۂ تولید کے ایک قطرہ میں کروڑوں نہیں تو لاکھوں جرثومے ہوتے ہیں جن میں سے ہر جرثومہ میں بچہ بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اول تو یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہر جنسی اختلاط پر بالضرور حمل قرار پا جائے۔ اس صورت میں ہر اختلاط سے لاکھوں بچے قتل ہو جاتے ہیں۔ اور جب حمل قرار پا جائے تو ان لاکھوں جرثوموں میں سے صرف ایک جرثومہ بچہ کی صورت اختیار کرتا ہے (یا زیادہ سے زیادہ دو تین جرثومے) باقی تمام جرثومے ضائع چلے جاتے ہیں ان جرثوموں کو بھی ہلاک شدہ اولاد تصور کرنا چاہیئے۔

(۳) استقرارِ حمل کے بعد جنسی اختلاط تو بہرحال "قتلِ اولاد" قرار پا جائے گا کیونکہ اس کے بعد تمام جرثومے ضائع ہوتے ہیں نیز اگر میاں بیوی میں سے کوئی عقیم (بانجھ) ہو تو فریق ثانی کے تمام حیات آور جرثومے مستقلاً ضائع ہو جاتے ہیں۔ کیا اسے بھی قتلِ اولاد تصور کیا جائے گا۔

قطع نظر ان دلائل کے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ (بفرضِ محال) "قتلِ نفس" ہے تو کیا "قتلِ نفس" بہرحال اور بہر صورت جرم ہے؟ اگر یہ بہرحال جرم ہے تو جب ملک کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہزاروں نوجوانوں کو میدانِ جنگ میں بھیجا جاتا ہے کہ وہ اپنی جان دے کر ملک کی حفاظت کریں، تو اس "قتلِ نفس" کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اجتماعی مصالح کی خاطر افراد کا جان دے دینا، یا انھیں جان دینے کے لئے حکماً میدانِ جنگ میں بھیج دینا، نہ صرف یہ کہ کوئی جرم نہیں، بلکہ قابلِ ستائش عمل ہے اور اگر یہ قتلِ نفس دین کی حفاظت کے لئے ہے جسے قرآن بلند ترین درجہ "شہادت" قرار دیتا ہے تو اسے کبھی جرم قرار دینا چاہئے لیکن اسے کوئی بھی جرم قرار نہیں دیتا۔ لہٰذا اگر اجتماعی ضرورت یا حق کی حفاظت کے لئے بھیجے جانے والے نوجوانوں کو موت کے منہ میں

دھکیل دینا جرم نہیں تو جو بچے ہنوز عدم سے وجود کی طرف نہیں آئے (اجتماعی مصالح کی خاطر) انہیں وجود میں نہ آنے دینا کس طرح جرم قرار پا جائے گا؟

اب تیسرے اعتراض کو لیجئے۔ یعنی یہ کہ بچوں کی پیدائش پر حدبندی کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اللہ کی رزاقیت پر ایمان نہیں۔ یہ سوال نسبتاً تفصیلی گفتگو چاہتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷/۳۱) "اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی"۔ اس سے بھی وسیع مفہوم میں دوسرے مقام پر ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو"۔ ان اور اسی جیسی دیگر آیات کو اس خیال کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب رزق کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے تو پھر اس خیال سے کہ اگر آبادی زیادہ ہو گئی تو انہیں کھانے کو نہیں ملے گا، پیدائش پر تحدید خدا کی رزاقیت کے ایمان کے منافی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان آیات کے صحیح مفہوم تک آئیں، ذرا دیکھئے کہ ان کا جو مطلب ہمارا مذہب پرست طبقہ لیتا ہے اس کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ مثلاً

(۱) یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی (کم از کم) آدھی آبادی ایسی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اور جب قحط پڑتا ہے تو لاکھوں افراد بھوک سے مر جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے لے رکھی ہے تو اس قدر مخلوق خالی پیٹ کیوں سوتی ہے اور اتنی آبادی بھوک سے کیوں مر جاتی ہے؟

(۲) کہا جائے گا کہ یہ لوگ حصولِ رزق کے لئے کوشش نہیں کرتے لیکن یہ بھی غلط ہے۔ قحط کے زمانے میں ہزار کوشش کے باوجود کچھ نہیں ملتا۔ اور عام حالات میں بھی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) ایک مزدور دن بھر محنت کرتا ہے۔ شام کو اسے دو روپے ملتے ہیں۔ اس کی ایک بیوی اور آٹھ بچے ہیں۔ دو روپے میں اتنا آٹا نہیں ملتا جس سے ان افراد خاندان کا دو وقت پیٹ بھر سکے۔ اس لئے انہیں ایک وقت فاقہ کرنا پڑتا ہے۔

(۳) آپ کہہ دیں گے کہ یہ ملک کا غلط معاشی نظام ہے جس کی وجہ سے اس مزدور کو اتنا نہیں ملتا جس سے اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ اسے اجرت اتنی ملنی چاہیئے جس میں اس کا گذارہ ہو جائے۔

لیکن اس سے تو آپ "خدا کی رزاقیت" سے نیچے اتر کر انسانوں کے معاشی نظام کی طرف آ گئے! کیا یہ چیز خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی نہیں؟

یہ چیز خدا کی رزاقیت کے منافی نہیں۔ ان آیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ ملک کا معاشی نظام ایسا ہونا چاہیئے جو خدا کی اس ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لے اور افرادِ مملکت کو اطمینان دلا دے کہ ان کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ اگر صورت حالات ایسی ہو کہ مملکت کی تمام کوششوں کے باوجود ملک میں اتنی پیداوار نہ ہو سکے

جس سے تمام آبادی کو بقدرِ ضرورت کے مطابق رزق مل سکے اور مملکت کے پاس اتنے ذرائع بھی نہ ہوں کہ باقی ماندہ ضرورت پوری کرنے کے لئے باہر سے غلہ منگا سکے۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کی آبادی میں بے محابا اضافہ ہوتا جا رہا ہو تو ایسی صورت میں وہ مملکت کیا کرے؟! کیا ایسی صورت میں یہ بہتر ہوگا کہ آبادی بے حد و نہایت بڑھتی جائے اور بھوک سے مرتی جائے یا یہ کہ آبادی کے بڑھنے کی حدبندی کر دی جائے تاکہ لوگوں کو بافراط رزق مل جائے؟! ہمارا مذہب پرست طبقہ کہتا ہے کہ پہلی صورت اسلام کی تعلیم اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے اور دوسری شکل شریعت کی رو سے ناجائز۔ اس میں کلام نہیں کہ بہترین شکل یہ ہوگی کہ ملک کی آبادی کی نسبت سے پیداوار بڑھائی جائے لیکن ہم اسے پھر دہرائیں گے کہ اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ پوری کوشش کے باوجود ملک کی پیداوار آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی، تو اس وقت کیا کیا جائے؟

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اگر تمام دنیا کی پیداوار اور آبادی کو سامنے رکھا جائے تو پیداوار ضرورت سے کم نہیں ہوگی۔ سو اول تو یہ گفتگو محض قیاسی ہے۔ اعداد و شمار پر مبنی نہیں۔ (بلکہ جس قدر اعداد و شمار دستیاب ہو سکتے ہیں وہ اس مفروضہ کے خلاف جاتے ہیں) لیکن دنیا آج کل جس طرح اقوام کے دائروں میں بٹی ہوئی ہے، اس کے پیشِ نظر ہر قوم کی اپنی اپنی ضرورت اور اسے پورا کرنے کے اپنے اپنے ذرائع ہیں۔ جن اقوام کے پاس فاضل پیداوار ہوتی ہے، وہ اس کی قیمت وصول کئے بغیر دوسری اقوام کو نہیں دیتیں ——— اور اس کی قیمت میں جو کچھ دینا پڑتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے ——— اس لئے سردست ساری دنیا کی پیداوار اور آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب قرآنی تصور کے مطابق، تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کرے گی اور "ما فی السمٰوٰت والارض" انسان کے زیرِ تسخیر آ جائے گا، اس وقت رزق کی کمی کا مسئلہ ہی باقی نہیں رہے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس کا کیا حل ہے؟

آئیے اب دیکھیں کہ "ضبطِ ولادت" کے معاملہ میں قرآن کریم سے ہمیں کیا راہنمائی ملتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم ساری عمر بچے پیدا کرتے رہو اور اگر کسی نے اس میں کوتاہی کی یا کسی حد تک پہنچ کر رک گیا تو قیامت میں اس سے بازپرس کی جائے گی۔ انسان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے لیکن جس طرح دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کو عند الضرورت استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے گا۔ اگر آپ کے بازوؤں میں قوت ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ آپ ہر وقت اس قوت کو استعمال کرتے رہیں۔ اسے بہرحال عند الضرورت ہی استعمال کیا جائے گا۔ یہی کیفیت ان صلاحیتوں اور قوتوں کی ہے۔ ان کا بلا ضرورت استعمال اسراف و تبذیر ہے جس کی قرآن کریم میں سخت ممانعت آئی ہے۔ لہٰذا اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو اس وقت بروئے کار لانا چاہیئے جس وقت اولاد پیدا کرنے کی ضرورت ہو۔ اب رہا اولاد کی ضرورت کا سوال، سو اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے بیوی بچوں کی محبت کو وجہِ جاذبیت بتایا ہے۔ (وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرنا نہیں سکھاتا) لیکن اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اولاد پیدا کرنے کا سلسلہ متواتر جاری رکھو۔

یعنی جب ایک بچہ پیدا ہو جائے تو دوسرے بچے کی پیدائش کی بنیاد فوراً رکھ دو۔ بچوں کو عند الضرورت پیدا کرنا ہی اس صلاحیت کا صحیح استعمال ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)۔ "تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی (کے بمنزلہ) ہیں۔ سو تم اپنی کھیتی میں جب چاہے آؤ" کھیتی کی تشبیہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہیں۔ اور "جب چاہو" سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کھیت میں عند الضرورت نسل اگائی جاتی ہے۔ اسی طرح اولاد بھی عند الضرورت پیدا کی جائے گی۔ مثلاً کھانے پینے کے معاملہ میں قرآن نے کہا ہے کہ كُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (۲/۳۵) "تم اس سے جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد "عند الضرورت کھانا" ہی ہے نہ کہ ہر وقت کھاتے رہنا۔ (اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر آئیگی)۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ تم مسلسل بچے پیدا کرتے رہو۔ نہ ہی فطرت نے اسے حیوانوں کی طرح مجبور کیا ہے کہ ایک وقت کے بعد اسے ضرور بچہ پیدا کرنا ہوگا۔ انسان کے ہاں بچے عند الضرورت پیدا کئے جائیں گے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی یا (FAMILY PLANNING) کہتے ہیں۔ اگر بیوی کی صحت خراب ہے تو آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ ضرور بچے پیدا کریں۔ اگر (موجودہ معاشی نظام میں) آپ کی آمدنی اتنی نہیں کہ آپ زیادہ بچوں کی کفالت کر سکیں تو آپ بچوں کی تعداد پر خود حد بندی عاید کر سکتے ہیں۔ یہ انفرادی مثالیں ہیں۔ اگر اجتماعی مصالح کا تقاضہ ہے کہ ملک میں زیادہ بچے پیدا نہ ہوں تو افزائش نسل کی تحدید کی جا سکتی ہے۔ اگر اجتماعی مصالح کی خاطر خوراک کا راشن کیا جا سکتا ہے (اور راشن اس کے سوا اور کیا ہے کہ خوراک کی حد بندی کر دی جاتی ہے)۔ اگر جانوروں کی کمی کی وجہ سے ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کیا جا سکتا ہے تو اس قسم کے ہنگامی حالات میں بچوں کی تعداد پر حد بندی کیوں نہیں عاید کی جا سکتی؟ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ایک شخص کے انفرادی ذوق کو ٹھیس لگتی ہے (یعنی اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کے ہاں زیادہ بچے ہوں)۔ لیکن اجتماعی مصالح کی خاطر انفرادی ذوق کا کسی حد تک ایثار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں کہ ہفتہ بھر کے راشن کی شکر ان کے ایک دن کے ذوق کی تسکین بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن اجتماعی ضرورت کے لئے انہیں راشن قبول کرنا پڑتا ہے۔ البتہ مستثنیات کی ہر قانون اور قاعدے میں رعایت رکھی جاتی ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں ضبط ولادت (یا خاندانی منصوبہ بندی) کی اسکیم بالضرور نافذ ہونی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمام حالات کا جائزہ لینے اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے پوری پوری کوشش کے بعد بھی حالات ایسے ہوں جن میں آبادی کی تحدید ناگزیر ہو جائے، تو اس صورت میں اس قسم کا اقدام قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ہوگا۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ اس کے لئے (عند الضرورت) ذرائع کیا اختیار کئے جائیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور آپ کی گہری توجہ کا محتاج۔ اس لئے کہ اس میں بنیادی نقطہ ایسا ہے جو شاید آپ کے سامنے پہلی مرتبہ آئے، اور چونکہ وہ ہمارے

عام تصور اور دنیا جہان کی روش کے خلاف دکھائی دے گا۔ اس لئے سطحی مطالعہ سے بات کی تہ تک پہنچنا مشکل ہو گا۔

ہمارے ہاں ازدواجی زندگی کا بنیادی مقصد جنسی اختلاط ہوتا ہے[1] باقی مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے اس کا بنیادی مقصد رفاقت (COMPANIONSHIP) ہے (زوج کا مفہوم ہی یہ ہے) وہ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰/۲۱)۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے خود تم میں سے تمہاری ازواج پیدا کیں تاکہ تمہیں ان سے سکون حاصل ہو۔ اور اس نے تم میں محبت اور رحمت پیدا کی۔ یقیناً اس حقیقت میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ یعنی محض جذباتی نگاہ سے دیکھو تو سلسلۂ ازدواج جنسی جذبات کی تسکین اور افزائش نسل کا ذریعہ دکھائی دے گا۔ لیکن ذرا فکر کی آنکھ سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ اس سے مقصود رفاقت، باہمی سکون، محبت اور رحمت ہے۔ جنسی جذبات کی تسکین یا افزائش نسل ثانوی چیز ہے۔

اس کے بعد جنسی جذبہ کی طرف آیئے۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ابن آدم کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ جنسی جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے۔ اس نے اس کے کان میں یہ افسوں کچھ اس طرح پھونکا کہ اس کی ساری تاریخ اس سے متاثر چلی آرہی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ سب سے پہلے تو اسے سمجھ لیجئے کہ خود "انسانی فطرت" کا تصور بھی فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت مجبور اشیاء کی روشِ زندگی کا نام ہے۔ جو صاحبِ اختیار ہو اس کی فطرت کیا؟ البتہ اس کی زندگی کے کچھ طبعی تقاضے ہیں اور اس کے بعد بلند انسانی زندگی کے مقاصد۔ جہاں تک طبعی تقاضوں کا تعلق ہے وہ حیوانات اور انسان میں مشترک ہیں۔ بھوک اور پیاس انسان کے طبعی تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) آپ کسی گہری سوچ میں منہمک ہیں اور آپ کو پیاس لگتی ہے۔ اس تقاضے کی ابتدائی منازل میں آپ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تاآنکہ یہ آپ کے ادراک پر غالب آجاتا ہے۔ اگر آپ اس پر بھی اس کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہنچاتے (پانی نہیں پیتے) تو آپ بیمار ہو جاتے ہیں۔ اس پر بھی آپ پانی نہیں پیتے تو آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی حالت بھوک کے تقاضے کی ہے اگرچہ اس میں موت نسبتاً زیادہ وقت کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ طبعی تقاضے جسم کی ضرورت کے ماتحت از خود ابھرتے ہیں اور اگر ان کی تسکین نہ کی جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور آخر الامر مر جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ کیا جنسی تقاضا بھی اسی قسم کا ہے؟ بادی النظر آپ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ یہ تقاضا اس قسم کا نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا ـــــ ساری عمر میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اپنے

---

[1] یہی وجہ ہے کہ رخصتی کے بعد اس جوڑے کی پہلی ملاقات جنسی اختلاط پر منتج ہوتی ہے۔

کام یا خیالات میں منہمک ہوں اور یہ تقاضا (پیاس کی طرح) از خود ابھرا ہو۔ یہ تقاضا کبھی نہیں ابھرتا جب تک آپ اسے خود نہ ابھاریں۔ یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جب تک آپ کے خیالات اسے بیدار نہ کریں۔

حیوانات میں یہ تقاضا از خود بیدار ہوتا ہے لیکن صرف اس وقت جب ان سے فطرت نے افزائشِ نسل کا کام لینا ہوتا ہے۔ آپ سانڈ کو دیکھئے۔ وہ سال بھر گایوں کے غلے میں پھرتا رہے گا لیکن نہ کبھی کوئی گائے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گی نہ وہ خود اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ لیکن جب ان کے اختلاط کا موسم (MATING SEASON) یا وقت آئے گا تو یہ جذبہ از خود بیدار ہو جائے گا۔ اور اختلاط کے بعد از خود پھر سو جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ وہاں بھی یہ جذبہ بھوک اور پیاس کے جذبات کی طرح نہیں۔ یہ صرف اس وقت بیدار ہوتا ہے جب اس سے افزائشِ نسل مقصود ہو۔

لیکن انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان ان تقاضوں کو اپنے اختیار سے ابھار سکتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ فطرت نے حیوان اور انسان میں یہ فرق کیوں رکھا ہے؟ بادیٔ النظر میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ فطرت اولاد پیدا کرنے کے معاملہ میں انسان کو حیوانات کی طرح مجبور نہیں رکھنا چاہتی۔ حیوانات کو جب "اُدھر کا اشارہ"[1] ہوتا ہے تو وہ اولاد پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان کے معاملہ میں فطرت ایسا نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اس معاملہ کو انسان کے اختیار میں دیدیتی ہے کہ وہ جب اولاد پیدا کرنا چاہے، اپنی مرضی سے اس جذبہ کو ابھارے اور افزائشِ نسل کی صلاحیت کو بروئے کار لے آئے۔

لیکن انسان، جس طرح دیگر معاملات میں اپنے اختیار کو ناجائز استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح اس معاملہ میں بھی کرتا ہے فطرت نے اس کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں یہ التزام بھی رکھا ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے ساتھ کچھ لذت بھی مل جائے۔ مثلاً غذا سے مقصود جسم کی پرورش ہے لیکن فطرت نے غذاؤں میں لذت بھی رکھ دی ہے۔ اب دیکھئے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا ہے؟ اس نے ضرورت کے پہلو کو محض بامرِ مجبوری ساتھ رکھا ہے اور لذت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے (کھانے پینے گھرانوں میں) کھانوں میں ایک فیصدہ ضرورت کا پہلو ہوتا ہے تو ننانوے فیصد لذت کا۔ حصولِ لذت ممنوع نہیں، بشرطیکہ لذت ضرورت کے تابع رہے۔ نہ کہ مقصود بالذات بن جائے۔ جس طرح انسان نے اپنے اختیار و ارادہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کھانے پینے کے معاملہ میں لذت کو مقدم قرار دے لیا اور ضرورت کو مؤخر، اسی طرح اس نے جنسی صلاحیت کے ساتھ کیا۔ وہ صلاحیت تھی افزائشِ نسل کی خاطر (جس کے ساتھ فطرت نے لذت بھی شامل کر دی تھی) لیکن اس نے جنسی لذت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور ضرورت کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے ضرورت کے عنصر کو خارج ہی کر دینا چاہا اور لذت ہی لذت کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ (بعینہٖ جس طرح آپ نے بعض لوگوں

---

[1] چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے (غالب)

کے متعلق سن ہوگا کہ وہ لذیذ ترین غذائیں کھاتے ہیں۔ اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتے ہیں۔ اور پھر کھانے لگ جاتے ہیں)۔ ضرورت کے عنصر کو خارج کر کے محض لذت کو مقصود بنا لینا ایسی "جنسی بدنہاد" (SEX PERVERSION) پیدا کر دیتا ہے جس کی آخری حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ عام زناکاری اس کی ابتدائی شکل ہے جس میں ضرورت (یعنی اولاد پیدا کرنے کے مقصد) کو خارج کر کے خالص لذت کو مقصود بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد حصولِ لذت کے سینکڑوں طرق و اطوار ایجاد و اختیار کئے جاتے ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ جنسی صلاحیت کا مقصد افزائشِ نسل ہے۔ اس مقصد کو چھوڑ کر اسے محض حصولِ لذت کے لئے استعمال کرنا مقصدِ فطرت کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نے جنسی اختلاط کے جائز و ناجائز ہونے کے لئے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس حقیقت کو نکھار کر سامنے لے آتی ہیں۔ وہ ان عورتوں کی فہرست دے کر جن سے نکاح حرام ہے کہتا ہے کہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ ان سے اختلاط "مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ" ہو (النساء)۔ "محصنین" کے معنی ہیں حفاظت سے رکھنا۔ قلعہ بند کر لینا۔ محفوظ کر لینا۔ اور "مسافحین" کے معنی ہیں محض بہا دینے کی خاطر جنسی اختلاط کرنا۔ چونکہ نکاح اور زنا میں ابتدائی فرق یہ ہے کہ نکاح میں جنسی اختلاط سے مقصد نطفہ کو رحم میں محفوظ کر دینا ہوتا ہے تاکہ اس سے افزائشِ نسل ہو اور زنا میں کوشش کی جاتی ہے کہ لذت تو ملے لیکن نطفہ نہ ٹھہرے (وہ بہہ جائے) اس لئے قرآن کی ان اصطلاحات کا اولین مفہوم بالترتیب نکاح اور زنا ہے۔ لیکن اس سے قرآن نے خود جنسی اختلاط کی نوعیت اور غایت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی

(۱) اگر جنسی اختلاط بلا نکاح ہے تو وہ ہر حال میں ناجائز ہے۔ اس سے مقصد اولاد پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ محض حصولِ لذت ہوتا ہے۔

(۲) نکاح کے ساتھ جنسی اختلاط سے مقصد افزائشِ نسل ہے۔ اگر یہ مقصد پیشِ نظر نہیں، اور اختلاط محض حصولِ لذت کے لئے ہے تو یہ فطرت کی عطا کردہ صلاحیت کا غلط استعمال ہے۔ اس صورت میں بیوی "حرث" (کھیتی) نہیں رہتی عیاشی کا سامان بن جاتی ہے۔

(۳) اس صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ نکاح کے بعد جنسی اختلاط افزائشِ نسل کے لئے ہو۔ بیوی "حرث" (کھیتی) ہے۔ لذت کی خاطر جنسی صلاحیت ضائع کرنے کا آلہ بن کر نہ رہ جائے۔

اس سے ضبطِ ولادت کا سارا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ

(ا) اولاد عند الضرورت پیدا کرنی چاہیئے۔ انسان کو اس باب میں اختیار بلا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ اور یہ ہم نے اب دیکھ لیا ہے کہ

(ب) غیر منکوحہ عورت کے ساتھ جنسی اختلاط حرام ہے۔ اور

(ج) منکوحہ بیوی کے ساتھ اختلاط اس وقت مطابق مقصدِ فطرت ہے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو۔

لہٰذا جب اولاد پیدا کرنا مقصود نہ ہو، تو بیوی کے ساتھ جنسی اختلاط کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کی رو سے خاندانی منصوبہ بندی کے لئے نہ مانعِ حمل ادویات و تدابیر کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی مرد یا عورت کو بانجھ بنا دینے کی حاجت۔ وہ خود عائد کردہ پابندی کے ماتحت، باہمی اختلاط سے مجتنب رہتے ہیں اور اس وقت تک مجتنب رہتے ہیں جب تک انہیں بچہ پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ اس میں نہ "عزل" کی ضرورت پڑتی ہے[1] اور نہ ہی مانعِ حمل تدابیر کے عام ہونے سے حرامکاری کے بڑھ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

آپ جھٹ سے کہہ دیں گے کہ یہ ناممکن ہے۔ بیوی بھلی چنگی موجود ہو اور مرد برسوں تک اس کے پاس نہ جائے، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی وہ مقام تھا جس کے متعلق ہم نے شروع میں (WARNING) دی تھی کہ چونکہ یہ بات آپ کے سامنے (غالباً) پہلی دفعہ آئے گی اور انوکھی سی معلوم ہوگی اس لئے آپ سطحی طور پر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ جائیے گا۔ گہرے غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچئے گا۔

یہ ناممکن نہیں، ممکن ہے۔ اور ایسا ممکن کہ اس کے لئے آپ کو کسی کاوش و تردد کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ جنسی جذبات انسان کے اپنے خیال سے بیدار ہوتے ہیں۔ از خود کبھی نہیں ابھرتے۔ اور انسان کے خیالات اس کی تعلیم و تربیت اور عقائد و نظریات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ بیوی کے "ایام" کے دوران آپ کا خیال بھی مقاربت کی طرف نہیں جاتا۔ لیکن ایک غیر مسلم اس میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ ان دنوں مقاربت جائز نہیں۔ اس لئے آپ کا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا۔ یا مثلاً ایک غلط کار نوجوان جو غیر عورتوں تک پہنچنے میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے، راتوں کی تنہائی میں، اپنی جوان ہمشیرہ کے پاس سویا رہتا ہے حالانکہ اس وقت کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی طرف وہ نگاہِ بد سے دیکھتا تک نہیں۔ یہ سب خیالات کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟ غالباً پچھلے سال کا ذکر ہے۔ اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا حال شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم رہتے تھے۔ ان کے ہاں نہایت خوبصورت دو تین بچے بھی تھے کہ ایک دن اتفاقاً ان کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ انگلینڈ میں ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک

---

[1] "عزل" افزائشِ نسل کے مقصد سے گریز، اور لذت کے حصول کا اس زمانے کا وضع کردہ ذریعہ تھا جب ہنوز مانعِ حمل آلات وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب ہم نے کہا تھا کہ عزل سے متعلق روایات کبھی نبی اکرمؐ کی احادیث نہیں ہو سکتیں تو اس کی وجہ کیا تھی۔ کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ صحابہ کبارؓ عزل کی اجازت مانگتے ہوں گے اور رسول اللہؐ اس کی اجازت دیتے ہوں گے۔ اور وہ بھی اس مقصد کے لئے کہ اگر لونڈیوں کو حمل قرار پا گیا تو ان کی قیمت کم ہو جائے گی۔ استغفر اللہ۔ بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جن میں لوگ (باقی اگلے صفحہ پر)

امریکہ اپنے ساتھ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ بھائی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کی کوئی بہن بھی ہے۔ اور بہن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا کوئی بھائی ہے۔ اتفاق سے لڑائی کے بعد وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا۔ اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہوگئی (جو اب جوان ہو چکی تھی) اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اور بیس سال تک انہیں اپنی سابقہ رشتہ داری کا علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہیں تھا۔

جس دن انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان کی شادی کو آٹھ دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس بات کا علم ہونے کے بعد ان پر جو قیامت گزری ہے اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا تھا، جو انہوں نے اخبارات کو دیئے تھے۔ ان کے کتنے دن رونے میں کٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بہرحال پادریوں نے ان کی تسلی تشفی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے!

یہ کیا تھا؟ صرف اس خیال کا اثر کہ بھائی بہن ازدواجی رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ایران کے شاہنشاہ پہلے زمانوں میں اپنی بہنوں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے خیالات کا اثر۔

لہٰذا اگر ہم قرآن کریم کے اس تصور کو اپنے عقیدہ کا جزو بنا لیں کہ بیوی سے جنسی اختلاط افزائش نسل کے لئے کیا جا سکتا ہے، تو ہمیں اس مقصد کے علاوہ جنسی مقاربت کا خیال تک بھی نہیں آئے گا۔ اور ہم اس کے تصور سے اس طرح دور بھاگیں گے جس طرح ایام کے دوران میں مقاربت کے خیال سے۔ ہمارے ہاں بیس پچیس برس ادھر تک (گاؤں میں بالخصوص) یہ خیال عام تھا کہ جب تک بچہ دودھ پیتا رہے مقاربت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس پر لوگ اس شدت سے پابند تھے کہ اگر کسی سے اس کی خلاف ورزی ہو جاتی تھی تو وہ منہ چھپائے پھرتا تھا۔ ان تصریحات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جنسی جذبہ انسانی خیالات کے تابع رہتا ہے اس لئے اس پر کنٹرول کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جنسی جذبہ کے لئے "اضطراری حالت" کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ جہاں تک خوراک کا تعلق ہے وہ اضطراری حالت کے امکان کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی لئے اس نے ایسی حالت میں حرام تک کھانے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن جنسی تقاضے کے لئے اس نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس اس نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا ... (۲۴/۳۳) جو لوگ شادی کا سامان نہیں پاتے، انہیں ضبط نفس سے کام لینا چاہیئے۔ یعنی اس نے یہ نہیں کہا کہ جس طرح کھانے کے معاملے میں اضطراری حالت میں حرام کھا لینے کی اجازت ہے اسی طرح ایسے شخص کے لئے بھی، جسے جائز طریق سے جنسی تسکین کا سامان میسر نہ ہو حرامکاری کی اجازت ہے۔

یہ تھا جنسیت کا وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا تھا۔ غور فرمایئے کہ اس تصور کی رو سے قرآن انسانیت کو کس مقام پر

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اپنی بہنوں بیٹیوں تک پر بھی دست درازی کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی حالات انتہائی درجہ کی مریض ذہنیت کے مظہر ہوتے ہیں انسان کی عمومی کیفیت وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ انتہائی درجے کے مجرم "تو مستثنیات" میں سے ہوتے ہیں۔

لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس قوم کے ہاتھوں سے قرآن کا دامن چھوٹ گیا تو جنسیات کے متعلق ان کا تصور پست ترین سطح پر پہنچ گیا۔ ذرا سوچئے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ان کے سلاطین کے محلات میں دو دو۔ تین تین ہزار ممسوعہ لونڈیاں ہوں۔ جن کے بازاروں میں عورتیں، بھیڑ بکری کی طرح فروخت اور نیلام ہوتی ہوں۔ جو چار بیویوں کے لئے وجہ جواز یہ قرار دیں کہ اس سے ایک پروگرام مرتب ہو جاتا ہے جس میں کوئی شب مقاربت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اور قیامت یہ کہ وہ ان چیزوں کو شریعت حقہ کے عین مطابق قرار دیں۔۔۔ ان کے جنسی تصور کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ ہماری قوم کس حد تک جنسیات میں ڈوبی ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو آپ طب یونانی کی کوئی کتاب (بلکہ کسی یونانی دواخانہ کی فہرست ادویات) اٹھائیے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے فیصد دوائیاں جنسیات کے ذیل میں آتی ہیں؟ اسی جنسیت زدہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس قسم کے فتاویٰ دیئے جاتے ہیں کہ (مثلاً) ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کسی ایسے جزیرہ میں پہنچ جائیں جہاں کوئی قریب ترین آبادی کی طرف واپسی تک "عارضی نکاح" کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ایک نوجوان جوڑا چند دنوں کے لئے بھی جنسی اختلاط کے بغیر گذارہ کر سکتا ہے۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جس کی آسمانی کتاب جنسیات میں اضطراری کیفیت کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ وہ جنسیات کو اس مقام پر رکھتی ہے جو مقام اسے فطرت کے پروگرام کے مطابق ملا ہے۔ ہم نے جنسیات کو اس مقام سے اتار کر اپنے اعصاب پر سوار کرا لیا ہے۔ اور پھر اسی کو اس کا صحیح مقام قرار دے کر اس سے پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے نکلتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔

ہمارا اپنا جنسی تصور یہ تھا۔ اس پر مغربی خیالات کے جھکڑ نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ یہ وہ آتش دوزخ ہے جس کے نرغے میں ہماری موجودہ نسل گھری ہوئی ہے۔ اسے اس عذاب سے نجات دلانے کی شکل اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ

(۱) جنسیات کے متعلق ہمارے قدیم مذہبی تصور میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ اور

(۲) مغربی خیالات کے طوفان کو روکنے کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس کے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو قرآنی خطوط پر متشکل کریں اور معاشرہ کی عمارت کو قرآنی بنیادوں پر استوار کریں۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) ضبط ولادت کا سوال اس لئے اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ ہمارے ملک کی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

(۲) اس مشکل مسئلہ کے حل کے دو گوشے ہیں۔

(۱) ملک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اور

(۳) اگر اس کے بعد بھی ضرورت رہے تو افزائشِ نسل پر حد بندی عاید کر دی جائے۔

(۴) جہاں تک (۱) کا تعلق ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک کا قرآنی نظامِ ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذرائع پیداوار قوم کی تحویل میں رہیں تاکہ جو منافع اس دولت افراد کے ہاں جمع ہو جاتا ہے وہ پیداوار کے اضافے کے لئے صرف کیا جا سکے۔ اور

(ب) رزق کی تقسیم ضرورت کے مطابق مملکت کی زیرِ نگرانی ہو۔

(۴) جہاں تک شق (۱) کا تعلق ہے قرآن کی رُو سے یہ چیز قابلِ اعتراض نہیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ہنگامی ضرورت کے لئے افزائشِ نسل پر پابندی عاید کر دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ہی اس لئے ہے کہ اسے افزائشِ نسل پر کنٹرول رہے۔ یہ اس معاملہ میں حیوانات کی طرح بے بس اور مجبور نہیں۔

(۵) لیکن برتھ کنٹرول (ضبطِ ولادت) کا طریقہ سیلف کنٹرول (ضبطِ خویش) ہے آلات و ادویات کے ذریعہ ایسی شکل پیدا کرنا جس سے جنسی لذت حاصل ہو جائے لیکن استقرارِ حمل نہ ہو جنسی اختلاط کے فطری مقصد کے خلاف ہے جنسی اختلاط افزائشِ نسل کے لئے ہے نہ کہ حصولِ لذت کے لئے۔ اگر افزائشِ نسل مقصود نہ ہو تو اختلاط بے محل ہو جاتا ہے۔

(۶) اس قسم کا ضبطِ خویش ناممکن تو ایک طرف، ذرا بھی مشکل نہیں۔ جنسی جذبہ انسانی خیالات کے تابع رکھا گیا ہے۔ اگر اس طرف خیال نہ کیا جائے تو یہ جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔

(۷) اس کے لئے ضروری ہے کہ

(ا) جنسیات کے متعلق صحیح قرآنی تصور عام کیا جائے۔

(ب) معاشرہ میں عورت کو وہ عزت کا مقام دیا جائے جس سے وہ جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ متصور ہونے کے بجائے وجہِ تکریمِ انسانیت سمجھی جائے۔

(ج) ان تمام اسباب و ذرائع کو سختی سے روکا جائے جو جنسی جذبہ کی بیداری کو عام کرتے ہیں ـــــ جنسی اشتعال پیدا کرنے والی فلمیں، تصاویر، لٹریچر، آرٹ، نمود و حسن اور عریانیت کے مظاہر وغیرہ وغیرہ ـــــ اور

(د) تعلیمی نظام کو صحیح خطوط پر تشکیل کیا جائے۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ ضبطِ ولادت کا مسئلہ ہی آسان ہو جائے گا بلکہ قوم کے پاس اس قدر عظیم توانائیاں محفوظ ہو جائیں گی جن سے ہر تعمیری پروگرام بطریق احسن تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کی بتائی ہوئی یہ وہ حقیقت ہے جس کی شہادت اب مغرب کے محققین بھی دے رہے ہیں۔ مثلاً جنسیات کا مشہور محقق، ڈاکٹر (J. D. UNWIN) اپنی کتاب (SEX AND CULTURE) میں لکھتا ہے۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں

پرورش نہ پا سکے تو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (صفحہ [illegible])

آخر میں ڈاکٹر اَن وِن لکھتا ہے۔

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک، قائم اور آگے بڑھتی رہیں، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا جس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی معاشرہ نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کر لی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتا۔ (صفحہ [illegible])

لیکن یہ بات ابھی انسان کی سمجھ میں شاید ہی آ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ابھی تک، بالعموم انسانی قامت نصیب ہی نہیں ہو سکا۔ یہ ابھی تک (بہ ہیئت مجموعی) حیوانیت کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ بلکہ اس کی سطح حیوانوں سے بھی پست ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(۱) فطرت نے حیوانات کے جنسی جذبہ پر تو (SAFETY VALUE) لگا دیا ہے کہ وہ اسے اس وقت بیدار کرتی ہے جب انہیں اولاد پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حیوانات خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) نہیں کر سکتے۔ انہیں اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا۔ لیکن اس عدم اختیار کا انہیں فائدہ یہ ہے کہ ان کی اس قدر قیمتی توانائی ضائع نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ محض لذت کی خاطر جنسی اختلاط پر قادر ہی نہیں۔

(۲) انسان کو فطرت نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ (FAMILY PLANNING) کر سکے۔ یعنی وہ اس باب میں حیوان کی طرح مجبور نہیں کہ جب فطرت چاہے اس سے اولاد پیدا کرا لے۔ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے (PLANNING) کے مطابق اولاد پیدا کرے۔ یہ فطرت کی بہت بڑی بخشش تھی جس سے اس نے انسان کو نوازا تھا۔

(۳) لیکن انسان کیا کرتا ہے؟ یہ (FAMILY PLANNING) نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے یہ اپنے آپ کو حیوانات کے درجے تک رکھتا ہے۔ یعنی وہ فیملی پلاننگ کر نہیں سکتے۔ یہ کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک سا ہے۔ لیکن

یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی اس قدر قیمتی توانائی کو محض حصولِ لذت کے لئے ضائع کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ حیوانات سے بھی پست درجہ پر ہے۔ وہ فیملی پلاننگ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی توانائی کو تو محفوظ رکھ سکتے ہیں! یہ اپنے اختیار کے غلط استعمال سے دُہرے نقصان میں رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ایسے انسانوں کے متعلق کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) یہ حیوانات کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ دوسری جگہ ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ..... (۹۵/۴-۵) ہم نے انسان کو بہترین توازن کے ساتھ حسین ترین ہیئت سے پیدا کیا تھا۔ لیکن یہ جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اسے پست سے پست ترین سطح تک لے جاتے ہیں۔ کیا یہ انسان کی پست ترین سطح نہیں کہ فیملی پلاننگ کی جو امکانی صلاحیت اسے خصوصیت سے عطا ہوئی تھی، یہ اس سے تو فائدہ نہ اٹھائے اور اپنے اختیار کے بیجا استعمال سے اپنی توانائیوں کو ضائع کرکے حیوانات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نقصان میں رہے؟ وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳/۱-۲) زمانہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنا نقصان کیا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فیملی پلاننگ کا تعلق عقل و فکر (REASON) سے ہے اور جنسی لذت کے حصول کا تعلق جذبات سے۔ جب بھی انسان عقل و فکر کو جذبات کے تابع رکھے گا، نقصان اٹھائے گا۔ لیکن جب جذبات سے عقل و فکر کی راہ نمائی میں کام لے گا، کامیاب ہوگا۔ قرآن یہی سکھانے کے لئے آیا تھا کہ جذبات کو کس طرح عقل و فکر کے تابع رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کی ساری (PROBLEMS) تین ہیں — زر، زمین، زن — انسان نے ان تینوں معاملات میں جذبات کو عقل و فکر پر یوں کھینچے کہ حصولِ لذت کو ضرورت پر غالب رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے معاشرہ میں فساد ہی فساد رونما ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے ان تینوں اہم ترین (اور مشکل ترین) مسائل کا حل ایک ایک فقرہ میں کر دیا۔ اس نے کہا کہ زر (دولت) مبادلۂ اشیاء کا آسان ذریعہ ہے اس سے یہی کام لینا چاہیئے۔ اسے جوڑ جوڑ کر (زر اندوزی یا لذتِ استکبار کی خاطر جمع کرتے رہنا اس کا بڑا غلط استعمال ہے) اس نے کہہ دیا کہ صحیح معاشی نظام وہ ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔ اس سے اس نے "زر" سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد کا علاج کر دیا۔ یعنی اس نے زر کو ضرورت کی شے قرار دیا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

زمین کے متعلق اس نے کہا کہ یہ نوعِ انسان کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتی ہے اس لئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھنا چاہیئے۔ اس (ذریعۂ رزق) کو ذاتی ملکیت میں لے لینا تاکہ دوسرے انسان تمہارے دست نگر ہو جائیں اور یوں تم حکومت کرنے کے جذبہ کی تسکین کر سکو بہت بڑا ظلم ہے (ظلم کے معنی ہیں کسی شے کو اس مقام پر رکھنا جس کے لئے اسے بنایا نہیں گیا)۔ اس طرح زمین کو بھی ضرورت کے لئے استعمال کرنا سکھایا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

اسی طرح اس نے عورت کے متعلق کہہ دیا کہ جنسی اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے، نہ کہ محض لذت حاصل کرنا۔ یہاں بھی اس نے جذبات کو ضرورت کے تابع رکھا ہے۔ اس نے اس طرح اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔

زر اور زمین کے متعلق انسان رفتہ رفتہ قرآنی تصور کی طرف آ رہا ہے لیکن زن کے متعلق ابھی اس نے اپنے نظریہ میں تبدیلی کا احساس نہیں کیا۔ اگرچہ یہ مسئلہ اس کے لئے وبالِ جان بن رہا ہے۔

جس دن انسان نے فطرت کا یہ راز پا لیا کہ انسان کو جنسی جذبہ پر اختیار و ارادہ اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ افزائش نسل کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکے۔ اور جنسی اختلاط سے مقصود افزائش نسل ہے، نہ کہ محض حصول لذت، وہ دن انسانیت کی تاریخ میں عظیم انقلاب کے آغاز کا دن ہوگا۔ دیکھیں یہ سعادت سب سے پہلے کس قوم کے حصے میں آتی ہے؟

جی چاہتا ہے کہ یہ سعادت پاکستان ہی کے حصے میں آئے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل میں وقت لگے گا۔ اس لئے اگر ہمارے حالات کا تقاضا ہو کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی فوری روک تھام کی جائے، تو بامرِ مجبوری کچھ وقت کے لئے ضبطِ ولادت کی ایسی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو مضرِ صحت نہ ہوں۔ لیکن اس صورت میں اس پر کڑی نگرانی کی جانی ضروری ہے کہ یہ چیزیں ان ہاتھوں تک نہ پہنچ جائیں جو ان کا ناجائز استعمال کریں۔ اگر ہمارے ہاں اسلامی آئین نافذ ہو گیا تو اس وقت انسداد فحش کاری کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جانی ضروری ہوں گی، یہ چیز بھی اسی ذیل میں آ جائے گی۔

لیکن یہ محض ہنگامی تدبیر ہوگی۔ مستقل اور مطابق منشائے فطرت وہی تدبیر ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی جنسی اختلاط کو صرف اولاد پیدا کرنے کے لئے صحیح سمجھنا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہو سکے گی۔

خلاصۂ مبحث چونکہ یہ موضوع مشکل بھی ہے اور فنی سا بھی، نیز اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو شاید پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہوں، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

(۱) انسان کے اندر (دیگر حیوانات کی طرح) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ لیکن یہ جذبہ (SEXUAL URGE) بھوک، پیاس کی طرح نہیں کہ از خود بیدار ہو جائے۔ اگر آپ ایک وقت تک اس کی تسکین نہ کریں تو آپ بیمار پڑ جائیں۔ اور کچھ وقت کے بعد آپ کی موت واقع ہو جائے۔ جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال سے بیدار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ انسان کے اپنے اختیار اور کنٹرول کی چیز ہے۔

(۲) حیوانات کی صورت میں اس جذبہ پر کنٹرول فطرت نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اس جذبہ کو اپنے اختیار اور ارادہ سے بیدار نہیں کر سکتے۔ جب فطرت اپنے پروگرام کے مطابق افزائش نسل چاہتی ہے تو ان میں اس جذبہ کو ابھار دیتی ہے اور جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے (یعنی حمل قرار پا جاتا ہے) تو پھر یہ جذبہ افسردہ، بلکہ مردہ ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ

خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) جیسا نام سے ہے بس کی بات نہیں۔ وہ نہ فطرت کے اشارے کے بغیر اولاد پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے اشارے کے بعد اولاد پیدا کرنے سے رک سکتے ہیں۔

(۳) لیکن انسان کو فطرت نے یہ اختیار اس لئے دیا ہے کہ وہ اپنے پروگرام (PLANNING) کے مطابق اولاد پیدا کرے۔ اس پر اس باب میں خارج سے عائد کردہ کوئی مجبوری نہیں۔ لہذا انسان کی صورت میں خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) فطرت کے منشاء کے عین مطابق ہے۔

(۴) خاندانی منصوبہ بندی، انفرادی حالات کے ماتحت بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی ضروریات کے مطابق بھی۔ قرآن کریم نے بیوی کو کھیتی سے تشبیہ دے کر یہ بتا دیا کہ جنسی اختلاط سے مقصود تخم ریزی ہے۔ (حصول لذت نہیں) اور یہ کہہ کر کہ تم اپنی کھیتی میں اپنے پروگرام کے مطابق جاؤ، اس کی صراحت کر دی کہ تمہیں اولاد پیدا کرنے کی مجبوری نہیں تم جب چاہو اولاد پیدا کرو۔ یعنی جب تم اولاد پیدا کرنا چاہو تو بیوی کے پاس جاؤ۔ اور جب نہ پیدا کرنا چاہو تو اختلاط مت کرو۔

(۵) لیکن انسان نے جنسی اختلاط کے مقصد کو تو پس پشت ڈال دیا اور حصول لذت کو مقصود قرار دے لیا۔ اس سے نہ صرف اولاد پیدا کرنے پر سے اس کا اختیار اٹھ گیا بلکہ وہ تمام مفاسد پیدا ہو گئے جو دنیا میں کم از کم نوے فیصد جرائم اور تباہ کاریوں کا موجب ہیں۔

(۶) اس کا علاج یہ ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں یہ خیال راسخ کیا جائے کہ جنسی اختلاط صرف افزائش نسل کیلئے ہے خالی حصول لذت کے لئے اختلاط خلاف منشائے فطرت ہے۔ جب یہ خیال انسان کے دل میں عقیدہ کی شکل اختیار کر جائے گا تو جنسی اختلاط پر کنٹرول کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔ اس وقت خاندانی منصوبہ بندی کے لئے بھی کسی خاص تردد کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(۷) لیکن انسان کے دل میں اس خیال کے راسخ کرنے کے لئے وقت درکار ہے۔ اس لئے اگر کسی معاشرہ میں حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ خاندانی منصوبہ بندی بلا تاخیر ناگزیر ہو جائے تو وہاں طبی تدابیر سے ضبط ولادت کی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں دو باتوں کا مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہوگا۔

(۱) یہ خیال ہر وقت پیش نظر رہے کہ یہ تدابیر محض ہنگامی ہیں۔ اس کا اصلی طریق ضبط خویش ہی ہے۔ اور

(۲) اس پر سخت نگرانی کی جائے کہ مانع حمل تدابیر غلط مقامات میں استعمال نہ ہوں جس سے فحش کاری آسان ہو جائے۔

(۸) مذہبی حلقوں کی طرف سے ضبط ولادت کے خلاف جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ نہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں اور نہ ہی ان کے دلائل کچھ وزن رکھتے ہیں۔ لے پہلے سمجھ لیجئے کہ ایک چیز ہے ضبط ولادت (خاندانی منصوبہ بندی) اور دوسری چیز ہے ضبط ولادت کی تدابیر۔ ضبط ولادت کے خلاف ان کے اعتراضات حسب ذیل ہیں۔

(ز) یہ قتلِ اولاد ہے۔ اس دلیل میں کوئی وزن نہیں۔ جب تک جرثومۂ حیات عورت کے رحم میں جنین کی شکل اختیار نہیں کر لیتا اسے اولاد یا نفس (جی یا جان) کہا نہیں جا سکتا۔ اگر جرثومۂ حیات کا ضائع کر دینا قتل نفس ہے تو ہر جنسی اختلاط میں کروڑوں جراثیم حیات ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور استقرارِ حمل کے بعد ان میں سے کسی جرثومہ کے بچہ بننے کا بھی امکان نہیں رہتا۔ اس صورت میں کوئی شخص بھی "قتل نفس" کے جرم سے بچ نہیں سکتا۔

(ح) اس سے اللہ کی رزاقیت پر ایمان اٹھ جاتا ہے۔

اللہ کی رزاقیت کے اگر یہ معنی ہیں کہ خدا ہر انسانی بچہ کو براہِ راست رزق دیتا ہے تو ہمارے روزمرہ کے مشاہدات اس مفہوم کی تغلیط کرتے ہیں۔ لاکھوں بچے بھوک سے مر جاتے ہیں اور کروڑوں کی پرورش پوری غذا نہ ملنے کی وجہ سے رک جاتی ہے۔ اللہ کی رزاقیت کا وعدہ صحیح قرآنی نظام کی وساطت سے پورا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت یہ نظام یہ دیکھے کہ آئی تعداد سے زیادہ بچوں کی پرورش کا انتظام کیا جانا ممکن نہیں تو وہ بچوں کی تعداد پر حد بندی کر سکتا ہے۔ یہ تو بڑی زیادتی ہو گی کہ ہم جتنے بچے جی چاہے پیدا کرتے جائیں اور ان کی پرورش کی ذمہ داری معاشرہ کے سر پر ڈالتے جائیں۔ اگر ہم نے اس کی ذمہ داری معاشرہ کے سر پر ڈالنی ہے تو اس کا فیصلہ بھی معاشرہ ہی کو کرنا چاہیئے کہ وہ کتنے بچوں کی پرورش کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر ضبطِ ولادت کا فیصلہ کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ البتہ ضبطِ ولادت کی صحیح تدبیر ضبطِ خویش ہے۔ لیکن جب تک اس کی شکل پیدا نہ ہو ہنگامی طور پر طبی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ حتی الامکان اس کا انتظام کیا جائے کہ ان کا استعمال ناجائز مقاصد کے لئے نہیں ہو گا۔

ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ملک کی زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ اس کے لئے نظامِ زمینداری کو بالکلیہ ختم کرنا ضروری ہے تاکہ محنت کرنے والے کسان کو یقین اور اطمینان ہو کہ اس کی محنت کی کمائی کو یونہی دوسرے نہیں لے جائیں گے۔ خدا نے زمین کو انسانوں کے لئے رزق کا ذریعہ بنایا ہے۔ چند افراد کے لئے سامانِ عیش نہیں بنایا۔

(۲) ان تمام راستوں کو بند کر دیا جائے جو جنسی جذبات کے اشتعال کا موجب بنتے ہیں اور فحش کاری کا انسداد کیا جائے۔

(۳) ضبطِ خویش کا خیال عام کیا جائے اور اگر ضبطِ ولادت کی طبی تدابیر ناگزیر ہوں تو اس امر کی سخت احتیاط کی جائے کہ ان کا استعمال ناجائز مقاصد کے لئے نہ ہونے پائے۔

"جذبات کا قوموں کے تمدن پر اثر"

یہ اور اس قسم کے دیگر اہم مسائل کے متعلق پرویز صاحب کی مایۂ ناز تصنیف "سلیم کے نام خطوط" کا مطالعہ کیجئے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور تیسری زیرِ طبع ہے۔ پرویز صاحب کی جملہ تصانیف

مکتبہ طلوعِ اسلام، ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ سے مل سکتی ہیں۔ کارڈ لکھ کر تفصیل معلوم کریں۔